حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

پرویز

شائع کردہ
طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ ۲۵/بی، گلبرگ۲، لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	----	حسن کردار کا نقش تابندہ
مصنف	----	علامہ پرویز
پبلشر	----	طلوع اسلام ٹرسٹ 25 بی گلبرگ 2 لاہور
طابع	----	دوست ایسوسی ایٹس
مطبع	----	عصمت اسلم پرنٹرز
ایڈیشن	----	اول - جون 1981
		دوم - جون 1995

کتابیں ملنے کے پتے

طلوع اسلام ٹرسٹ

25 بی گلبرگ II لاہور - 54660 پاکستان

فون: 879246 فیکس: 876219

- حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ! ۳
- کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ ۴۴
- دو قومی نظریہ، اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کی نگاہوں میں۔ ۷۵

باسمہ تعالیٰ

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِاعظم محمد علی جناحؒ)

کہا جاتا ہے کہ بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور بعید از قیاس ہوتی ہیں. اس کی بیّن مثال خود ہماری اپنی داستان ہے. ذرا غور فرمائیے کہ ایک قوم اپنے سامنے ایک بلند و بالا 'متعین' واضح اور روشن نصب العین رکھتی ہے. اس حصول کے لئے دس سال تک مسلسل مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے. اس جدّ و جہد میں ساری دنیا سے لڑائی مول لیتی ہے. جانکاہ مشقتیں برداشت کرتی ہے. صبر آزما مصائب جھیلتی ہے. لیکن جب دس سال کی اس مسلسل جدّ و جہد کے بعد وہ نصب العین حاصل ہو جاتا ہے، تو سوچنے بیٹھتی ہے کہ ہم نے اس کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اس سے مقصود کیا تھا؟ اس کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ ان سوالات کے اُبھارنے والوں میں بعض ایسی شخصیتیں بھی تھیں جو اس جنگ میں خود شریک تھیں. ان میں سے کوئی کہتا کہ دراصل ہندوؤں کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم ان سے الگ ہو جائیں. ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یعنی (بقول ان کے) اگر ہندو ذرا بھی کشادہ ظرف ہوتا تو ہم کبھی ہندوستان سے الگ نہ ہوتے. بالفاظِ دیگر اگر وہ آج بھی ذرا وسعتِ قلبی کا ثبوت دیں تو ہم ان سے فوراً گلے مل جائیں. دوسری طرف سے یہ

آواز اٹھتی کہ مسئلہ دراصل معاشی تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہمارے لئے اس کی گنجائش ہی نہ تھی ہم بڑے بڑے کارخانے لگاتے عظیم القدر ایوانات تجارت قائم کرتے، بڑی بڑی جائیدادیں کھڑی کرتے۔ ہم نے پاکستان اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا یعنی (بقول ان کے) یہ چند سرمایہ داروں اور زرپرستوں کی اسکیم تھی جس کے لئے قوم نے ایسی مہیب جنگ لڑی تھی۔ بعض ایک قدم آگے بڑھے اور یہاں تک کہنے میں بھی نہ کوئی باک سمجھا نہ شرم محسوس کی کہ تقسیم ہند درحقیقت انگریز کی اسکیم تھی اور قائداعظمؒ ان کا آلہ کار تھا۔

حصولِ پاکستان کا مقصد

حصولِ پاکستان سے مقصود کیا تھا۔ اس کے متعلق میں نے اپنے اُس مقالہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا عنوان ہے "کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟" اور جو چند صفحات کے بعد آپ کے سامنے آئے گا۔ اس میں، میں نے مستند حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں قرآنی نظام کو رائج کیا جا سکے۔ تجدید یادداشت کے لئے میں یہاں قائداعظمؒ کے وہ چند الفاظ دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں جو انہوں نے ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں ارشاد فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> "آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کے مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے، نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔"
>
> (قائداعظمؒ کا پیغام، مرتبہ سید قاسم محمود، صفحہ ۵۲)

جو لوگ تقسیم ہند کو انگریزوں کی سکیم قرار دیتے ہیں اور قائداعظمؒ کو ان کا آلہ کار ٹھہراتے ہیں، ان کے خبثِ باطن کے علاوہ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف انگریزوں جیسی قوم تھی جس کی سلطنت پر (اس کے زمانے میں) سورج تک غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف ہندو تھا جس کے پاس برلاؤں اور ٹاٹاؤں کی تجوریاں تھیں جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی زمیں دوز دہشت پسند تنظیمات تھیں۔ اُن کے مقابلے میں ایک نحیف و نزار سن رسیدہ شخصیت تھی جس کے

پاس نہ دولت کے خزانے تھے نہ لاؤ لشکر، نہ خفیہ تنظیمیں تھیں، نہ پوشیدہ اسلحہ۔ وہ تنہا بے سازو یراق یہ جو مکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی قوت تھی اور وہ تھی عظمتِ کردار کی بے پناہ طاقت۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے پاکیزہ عملِ پیہم۔ چونکہ آج ہماری قوم بدقسمتی سے اس تصور ہی سے بیگانہ ہو چکی ہے کہ حسنِ کردار کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے اور اس سے بے ساز و سامان کیسے کیسے محیّر العقول کارنامے ظہور میں آسکتے ہیں اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ حصولِ پاکستان کا راز اس معمارِ پاکستان کے یقینِ محکم، عزمِ بلند اور بے لوث کردار میں مضمر تھا۔ میں صحبتِ امروزہ میں اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی کوشش کروں گا، بالخصوص اس اعتراض کی تردید کہ تقسیمِ ہند کی سکیم انگریز کے ذہن کی اختراع تھی اور قائداعظمؒ اس کے اس مقصد کے حصول کے آلہ کار تھے۔

جہاں تک کردار کی عظمت (یعنی کیریکٹر کی بلندی اور پاکیزگی) کا تعلق ہے اس ضمن میں ایک بنیادی نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ نام و نمود کے خواہاں لوگ جب اپنی شہرت کے عروج پر پہنچ جائیں تو وہ اپنی گفتار و کردار کے بارے میں خاص احتیاط برتتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان کی شہرت داغدار ہو جائے۔ لہٰذا ان کے اس زمانے کے اعمال و افعال، کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ نہیں بن سکتے۔ کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ کسی کے اس زمانے کے احوال و کوائف ہوتے ہیں جب اس نے ہنوز کوئی مقامِ بلند حاصل نہ کیا ہو اور وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتا اور کرتا ہے اس میں تصنع اور آورد نہیں ہوتی۔ اس لئے ان میں اس کے جوہرِ کردار کی حقیقی جھلک دکھائی دے سکتی ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ جب حضور نبی اکرمؐ سے مخالفین نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ آپؐ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۰/۱۶)

میں نے اعلانِ نبوت سے پہلے جب میری حیثیت معاشرہ کے ایک عام فرد کی سی تھی تمہارے اندر زندگی گذاری ہے۔ میرے اس زمانے کے کردار کو سامنے لاؤ اور پھر سوچو کہ اس قسم کا کردار ایک سچے انسان کا ہوتا ہے یا جھوٹے آدمی کا!

حضورؐ کے اس جواب نے (جو بزبانِ وحی دیا گیا تھا) ہمارے سامنے کردار کے ماپنے کا صحیح پیمانہ رکھ دیا

ہے۔ میں اسی پیمانے کے مطابق' قائداعظمؒ کے کردار کی داستان' ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور سے شروع کروں گا جب انہیں ہنوز ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آغازِ سخن ۱۹۱۸ئہ سے کیا جاتا ہے۔ جب مانٹیگو۔چمسفورڈ سکیم کے سلسلہ میں' اس زمانے کے وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے۔ انہوں نے اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں' تلک' گوکھلے' دادا بھائی نوروجی کے علاوہ' مسٹر محمد علی جناحؒ سے بھی ملاقات کی اور اپنی ڈائری میں اس جواں سال سیاستدان کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کئے:۔

ایک صاف ستھرا' انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی۔ وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کرکے ہار گیا۔ لارڈ چمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی' لیکن جناح کی قوتِ استدلال نے اسے پوری طرح اُلجھا کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہوسکتی ہے کہ جناح جیسے انسان کو بھی نظامِ مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔

لندن سے (بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد) مسٹر جناح نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو حالات سخت ناسازگار تھے اور زمانہ انتہائی مشکلات کا۔ لیکن اس پر بھی بساطِ روزگار پر اس نووارد کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ عدلیہ کے سربراہ سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے ممتاز منصب کی پیش کش کی جس کا مشاہرہ اس زمانے میں پندرہ سو روپے تھا تو مسٹر جناحؒ نے اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ میں کم از کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ سر چارلس اسے ایک مجذوب کی بڑ قرار دے کر مسکرا دیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ یہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ ایک برگزیدہ نوجوان کی خود اعتمادی کا مظاہرہ تھا جو حقیقت بن کر رہا۔

یہ پہلی جنگِ عظیم کے آخری دور کی بات ہے۔ اس جنگ میں گو اتحادیوں کو بہ حیثیت مجموعی کامیابی

حاصل ہو رہی تھی لیکن ان جراحت ہائے پیہم سے برطانیہ کی حالت بسمل کی سی ہو رہی تھی اور حکومت اس قدر ذکی الحس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خلاف ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ کہہ بیٹھا کہ ہم انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومتِ ہند کے خلاف آزادانہ تنقید کریں۔ جناح کو ایسا موقع خدا دے۔ وہ اس زمانے میں مسز اینی بیسنٹ کی قائم کردہ، ہوم رول لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کی جس میں پہلے اہلِ ہند کی ان بے مثال قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں دی تھیں۔ اس کے بعد کہا:

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستانیوں سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود اتنا خون بہانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں! آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے...... یہ جنگ، آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاتر العقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے! یاد رکھئے کہ یہ اندازِ حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔

مسٹر جناح کے اس نعرۂ حریت کا اثر تھا کہ وزیرِ ہند کو دار العوام میں اعلان کرنا پڑا کہ

> ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں اور رفتہ رفتہ حکومتِ برطانیہ کے اس حصے میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

یہ آزادیٔ ہند کی عمارت کی پہلی اینٹ تھی جو قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

وزیرِ ہند نے تو حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کا اعلان کر دیا لیکن ہندوستان میں ایسے سرپھرے انگریز حکمران تھے جو نشۂ حکومت میں بدمست، اس تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اہلِ ہند کو کچھ سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ان میں لارڈ سڈنہم اور لارڈ ولنگڈن کا نام سرِفہرست آتا تھا جو یکے بعد دیگرے، اس صوبۂ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے جو جناح کا مسکن تھا۔ جناح نے ان دونوں سے جس

بے باکانہ انداز سے ٹکرلی۔ وہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ کا ولولہ انگیز باب ہے۔

لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے تو یہ سرمست بادۂ حریت، بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے گرجا اور لارڈ سیڈنہم کا نام لے کر کہا کہ

> یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش بہا تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی رہنمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حقِ خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

اُس دَور میں جرأت و بے باکی کی اس قسم کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد لارڈ ولنگڈن کی باری آئی۔ اس جابر حکمران نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ سازش کی تھی اور جناحؒ کو اس کا علم تھا۔ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو خوشامد پسندوں کے ایک گروہ نے ٹاؤن ہال میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اہالیانِ شہر کی طرف سے اس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ مسٹر جناحؒ انتہائی جرأت و بسالت سے اس جلسہ میں جا پہنچے، لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ ہال سے باہر آئے تو وہاں ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مسٹر جناحؒ نے وہاں جو شعلہ انگیز تقریر کی، اس نے فضا میں ایسا تہلکہ مچا دیا کہ ٹاؤن ہال کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس بے مثال کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سامعین سے کہا کہ

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ستمبر ۱۹۱۷ء کا یہ دن، بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

اہلِ بمبئی نے یہ جشن اس انداز سے منایا کہ وہاں جناحؒ میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ دیا۔ جو آج تک اس بطلِ حریت کے جذبۂ بیباکی کی یاد تازہ کرنے کا محسوس محرک ہے۔ اس میموریل کے قیام کے سلسلہ میں، ایک ہندو لیڈر مسٹر پی۔ ڈی۔ لام نے جو اپیل شائع کی تھی اس کے یہ الفاظ ایک درخشندہ حقیقت کے

آئینہ دار ہیں۔ اس نے کہا تھا:

کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں، جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناح کے عزمِ صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انہوں نے عوام کے حقوق کی راہنمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبِ وطن کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں تر و تازہ رہے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسٹر جناحؒ ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں!

یہ واقعہ تو لارڈ ولنگڈن کے رخصت کے وقت کا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی، مسٹر جناحؒ نے اس کے ہر غلط اقدام کی اس شدت اور سختی سے مخالفت کی جس کی اس زمانے میں، شاید ہی کوئی اور جرأت کر سکتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ زمانہ جنگ کا تھا جس میں انگریز اپنے خلاف خفیف سے خفیف تنقیدی آواز کو بھی استبداد کے آہنی شکنجہ سے دبا دینے پر تُلا بیٹھا تھا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جس میں مسٹر جناحؒ کو بھی، ہوم رول لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا، لارڈ ولنگڈن نے اپنے ایڈریس میں اہلِ ہند سے جنگ میں عملی تعاون کی اپیل کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کے ایڈریس کے فوری بعد مسٹر جناحؒ اسٹیج پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ہز ایکسیلینسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے اور ایکسیلنسی کے احترام کے باوجود میں اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں ـــــ لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے

ہم دونوں ہیں۔ ہمارے نزدیک "جرمن خطرہ" سپاہی دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے۔ ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریک کار نہ بنایا جائے۔

مسٹر جناحؒ تو ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر گاندھی جنہیں آزادی کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے، کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست کی معرفت، وائسرائے کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ

میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولیوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دورانِ جنگ ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادرِ ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حرمت پر کٹ مرے۔

مسٹر جناحؒ نے حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف صرف وار کونسل کی اس کانفرنس میں تقریر نہیں کی۔ وہ مختلف مواقع پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے وار کونسل سے اپنا استعفٰے پیش کر دیا۔ یہ استعفٰے جس خط کے ساتھ بھیجا گیا وہ ہندوستان کی تاریخِ آزادی میں منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ

حکومتِ ہند نے اور آپ نے زمانۂ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلا خوفِ تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندوستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے روند دیا ہے جن کے لئے حکومتِ برطانیہ نے جنگ لڑی تھی ــــــ انصاف کے بنیادی اصولوں کا عین اس وقت استیصال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ــــــ ان حالات کے تحت میں اپنے ان رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں ایک ایسے شخص

کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو، ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو تعاون کرنا امرِ محال ہے ———— میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانۂ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے مہذّب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

جنگ کے خاتمہ پر، حکومتِ برطانیہ نے اہلِ ہند کے تعاون کا صلہ اس رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں دیا جس کی رُو سے، امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں محبوس انسانوں کا قتل، ہلاکو اور چنگیز کی وحشت انگیزیوں اور خونریزیوں کی داستانوں کو فراموش کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قیامت خیز المیہ کے متعلق بیان دیتے ہوئے مسٹر جناحؒ نے کہا۔

رسوائے عالم رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے، ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوتے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے ہیں۔

اسی قسم کے تھے مسٹر جناحؒ کے جذباتِ تہوّر اور آزادی کے وہ مظاہر جن سے متاثر ہو کر مسٹر گوکھلے جیسے عظیم ہندو راہنما نے کہا تھا کہ

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی، وہ جناحؒ ہی کی بدولت ہوگی۔

مسٹر جناحؒ کے اس بے لوث کردار کی بنا پر، لوگوں کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ وہ کانگریس سے الگ ہو چکے تھے اور اس کے مسلک کے خلاف تھے۔

اس دوران میں، وہ مرکزی کونسل کی رکنیت کے لئے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ ان کا مدِمقابل کانگریس کا امیدوار تھا۔ "بمبئی کرانیکل" چوٹی کا نیشنل روزنامہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ووٹروں سے مسٹر جناحؒ کے حق میں اپیل کی اور کہا کہ

> ان کی گزشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حبّ الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ـــ علاوہ بریں جناحؒ کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت بڑا امتیازی مقام عطا کر دیا ہے ـــ اگر معمولی اختلاف کی بنا پر جناحؒ جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدّوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلّت کا ارتکاب ہوگا۔

قائداعظمؒ نے کوئی انتخابی مہم شروع نہ کی لیکن ان کے ہندو دوستوں نے از خود قریب ایک سو موٹریں فراہم کر دیں اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

اس وقت تک ہم مسٹر جناحؒ کی زندگی کے اس حصّہ سے متعلق گفتگو کر رہے تھے جب وہ ہندوستان کی عمومی سیاست کے لیڈر تھے۔ اب ہم اس وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ ملّتِ اسلامیہ کے قائد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں سرِآغازِ داستان اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیاستِ عالم کا موجودہ دَور میکیاولی کہلاتا ہے جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کرنا جائز ہے۔ لہٰذا اس سیاست میں جھوٹ، فریب، مکّاری، عیّاری، وعدہ فراموشی، پیمان شکنی وغیرہ سب جائز قرار پاتے ہیں۔ جو جس قدر شاطر اور چالباز ہو، وہ اسی قدر کامیاب اور نامور لیڈر مانا جاتا ہے اور قوم اس کے مجسّمے نصب کرتی ہے۔ اس وادیٔ پُرخار میں قائداعظمؒ کے مدِمقابل انگریز، ہندو اور تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمان سب "متحدہ محاذ" بنائے ہوئے تھے۔ میکیاولی سیاست میں انگریز تو استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ہندو اور (نام نہاد) مسلمان سیاسی لیڈر بھی اس باب میں اس سے پیچھے نہ تھے۔ مسٹر سری پرکاش، ۱۹۴۸ء میں، پاکستان میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر کی شام، کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندومت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزاروں سال مختلف حالات اور متباین ماحول میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔

اس ہندومت کا سب سے بڑا نمائندہ مسٹر گاندھی تھا جسے اس کی قوم "مہاتما" کہتی اور ایشور کا اوتار مانتی تھی۔ اس "مہاتما" کے متعلق قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے مفیدِ مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں، معمہ ہیں۔

بہرحال، یہ تھے وہ حریف جن سے قائداعظمؒ کو واسطہ پڑا تھا۔ ان کا یہ دس سالہ دورِ سیاست بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے تو ایک طرف، ان کے کسی بد سے بدتر دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولا یا فریب دیا ہو، وعدہ خلافی کی ہو یا بات کر کے مکر گئے ہوں۔ صاف، سیدھی، دوٹوک بات اور پھر اس پر چٹان کی طرح قائم۔ یہی تھی ان کی وہ خصوصیتِ کبریٰ جس پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دنیا کے مشہور ترین اخبار ـــ لندن ٹائمز ـــ نے ان کی وفات پر لکھا تھا کہ

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصّہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت۔ در

واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی۔ بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

دیانتدارانہ سیاست

لندن ٹائمز کے ان ریمارکس کی تائید میں قائد اعظمؒ کی زندگی کے بے شمار واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کروں گا۔ مسٹر اصفہانی نے اپنی کتاب QUADI-E-AZAM JINNAH AS I KNOW HIM میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ئہ کا ذکر ہے کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی۔ اس کیلئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلا مقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخِ نامزدگی سے دو دن پہلے بالکل خلافِ توقع ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کر لینا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریقِ مقابل کا یوں سامنے آجانا وجہ پریشانی ہوگیا۔ ایک شام (مرحوم) عبدالرحمان صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریقِ مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زرِ ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے۔ قائد اعظمؒ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائد اعظمؒ نے سخت برافروختہ ہو کر کہا کہ

> تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریقِ مخالف کو بٹھا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی قائد اعظمؒ نے جو اصول بیان فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ دورِ حاضرہ کی میکیاولی سیاست میں اخلاق کے دو ضابطے ہیں۔ پرائیویٹ زندگی کے لیے اور ضابطہ۔ پبلک زندگی کے لئے اور۔ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں:-

(دورِ حاضرہ کی سیاست میں) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار، رحم دل اور قابلِ اعتماد ہیں۔ ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا "کارِ ثواب" سمجھیں گے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

GUIDE TO MORALS, P-130

اور اسی بنا پر اٹلی کے مشہور مدبّر CAVOUR نے کہا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم بڑے بڑے شیطان کہلائیں۔ (انسان نے کیا سوچا؟ ص ۲۲۵)

قائداعظمؒ بھی اسی دَور کے سیاستدان تھے اور ان کے فریقِ مقابل بھی اسی سیاست کی بساط بچھائے ہوئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ ان کے اصولِ سیاست کیا تھے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا۔ "میرے عزیز یاد رکھو! پبلک زندگی میں اخلاقی دیانت پرائیویٹ زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ (پرائیویٹ زندگی میں بددیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن) پبلک زندگی میں بددیانتی سے لاتعداد لوگ مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزارہا ایسے لوگ بے راہرو ہو جاتے ہیں جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔"

مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائداعظمؒ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی میری عزت افزائی نہیں کرتے۔ دیانت دار ہونا انسانیت کا تقاضا ہے اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی؟ بالفاظِ دیگر جو دیانت دار نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔

کلکتہ کے انتخاب سے کہیں زیادہ اہم ایک اور انتخابی مہم درپیش تھی۔ ۴۷ء۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ وزارتیں قائم کرنے کا سوال درپیش تھا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب میں خضر حیات خاں کی وزارت نے استعفےٰ دیا تو گورنر نے نواب ممدوٹ سے تشکیلِ وزارت کے لئے کہا۔ عددی اعتبار سے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلم لیگ اپنے ساتھ کچھ غیر مسلم اراکین کو ملا کر وزارت قائم کرتی۔ قائداعظمؒ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس وقت ایسا کرلیں اور جب

آہستہ آہستہ مسلم لیگ طاقت پکڑ جائے تو پھر ان دوسرے ممبروں سے نپٹ لیا جاتے۔ قائداعظمؒ اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور تجویز پیش کرنے والے سے کہا کہ

آپ کان کھول کر سُن لیجئے کہ میں اس قسم کی سیاسی چالبازیوں اور مصلحت انگیزیوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دُور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو۔ میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہوگا اور یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہے۔

اس پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ نواب ممدوٹ نے وزارت متشکل کرنے سے انکار کر دیا اور گورنر نے پنجاب میں آرٹیکل ۹۳ نافذ کر دی۔ چند ہی مہینوں کے بعد پاکستان وجود میں آگیا اور نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی ـــــــــ (ماہنامہ المعارف لاہور۔ بابت نومبر، دسمبر ۱۹۷۶ء، حصہ انگریزی، ص ۳۷) [۱]

مُسلم لیگ فنڈ

ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ جو شخص دیانت دار نہیں وہ انسان ہی نہیں۔

---

[۱] نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۴ جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک صاحب کا خط چھپا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ممدوٹ وزارت کا قصہ اس طرح نہیں تھا جس طرح المعارف میں لکھا گیا ہے۔ المعارف کے واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ چیف جسٹس (ریٹائرڈ) محمد منیر صاحب نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ قائداعظم سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں قائداعظمؒ کی اصول پرستی کی تائید میں یہ واقعہ درج کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ بعد میں المعارف میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا فیصلہ محترم جسٹس منیر اور مراسلہ نگار ہی کر سکتے ہیں کہ کس کا بیان واقعہ کے مطابق ہے۔

جیسا کہ پرویز صاحب نے متعدد بار کہا ہے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت تک نہ تو تحریک پاکستان کے متعلق کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی قابل اعتماد سوانح حیات۔ ان حالات میں واقعات کی جزئیات میں اختلاف ممکنات میں سے ہے لیکن اصل سوال قائداعظمؒ کی اصول پرستی کا ہے جس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (طلوعِ اسلام)

دیانتداری کی سب سے بڑی کسوٹی روپیہ ہے۔ ہماری بڑی بڑی انجمنوں، تنظیموں، جماعتوں اور معتبر شخصیتوں کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ قائداعظمؒ کو اس ذمہ داری کا ایسا شدید احساس تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے لئے فنڈ کی اپیل کی تو ہر روز سینکڑوں منی آرڈروں پر خود دستخط کرتے تھے۔ آپ سوچئے کہ قائداعظمؒ جیسے مصروف اور نحیف و نزار شخص کے لئے ہر روز اتنی تعداد میں منی آرڈروں پر دستخط کرنا کس قدر دو بھر تھا۔ لیکن وہ خوشی خوشی ایسا کرتے، وہ بار بار اپنی انگلیوں کو سہلاتے اور پھر دستخط کرنا شروع کر دیتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے تو فرماتے کہ "فنڈ کی اپیل میں نے کی ہے۔ لوگ میرے اعتماد پر پیسے بھیجتے ہیں۔ مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا۔ اس لئے رسیدیں مجھے ہی دینی چاہئیں"۔

آپ اس جواب کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے جن میں کہا گیا ہے کہ "مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ سے حساب مانگنے والا کون ہو سکتا تھا؟ اس لئے اس سے مطلب

> یہ تھا کہ مجھے ان کے پیسوں کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا اور یہی ہے دیانتدار ہونے کے لئے بنیادی راز۔ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ مجھے ایک ایک پائی کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا، وہ بددیانت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کا مطلب ہی یہ بتایا تھا کہ خدا پوچھے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کیسے دیا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قائداعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرکاری مکان میں رہائش پذیر ہوگئے تو ان کی یہ روش تھی کہ جس کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ ہوتی اس کمرے کا بلب خود بجھا دیتے۔ اور مختلف کمروں میں چلتے پھرتے بلب جلانے اور بجھانے کا عمل متواتر ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ

> اسراف گناہ ہے اور اگر وہ روپیہ قوم کا ہے تو اس میں اسراف گناہِ عظیم ہے۔
>
> (اصفہانی ۱۲۵)

یہ تھا قائداعظمؒ کا کردار! انہوں نے مسلم لیگ کنونشن (۱۹۴۶ء) کی افتتاحی تقریر میں اس سوال کے جواب میں کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں، فرمایا تھا:

> عزتِ نفس، دیانت، امانت، یقینِ محکم اور قومی مفاد کی خاطر اپنے آپ کو محو کر دینے

کے لئے ہر وقت آمادگی. ان امتیازات کی شدتِ احساس کو کیریکٹر کہا جاتا ہے۔

یہی تھا قائدِ اعظمؒ کا وہ کردارِ بلند جس کے اعتراف ہیں " دی گریٹ ڈِوائڈ " کے مصنف ایچ وی ہڈسن " نے لکھا تھا کہ

> قائدِ اعظمؒ کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف نے بھی کبھی ان کے خلاف بد دیانتی یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا تھا. انہیں کوئی شخص کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا. نہ ہی وہ مرغِ بادِ نما تھے جو شہرت عطا کرنے والی ہواؤں کے ساتھ اپنا اپنا رُخ کردار بدل لیتے یا وقتی مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کرتے۔ وہ اصولوں کی پابندی میں چٹان کی طرح سخت اور بلند ترین عزتِ نفس وحمیت کے پیکر تھے۔ (تخلیقِ پاکستان، انگریزی، از جمیل الدین احمد، صفحہ ۲۶۶)

علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتے ہیں ؎

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری

اُنہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے

اور اس سے ہماری نگاہ کا رُخ، اقبالؒ جیسے حکیم الامت کی نظرِ انتخاب کی طرف پلٹتا ہے. مسٹر جناحؒ ہندی سیاست کی بوالعجبیوں سے دل برداشتہ ہو کر گوشہ نشین سے ہو چکے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں، انگریز اور ہندو کی ملی بھگت ایسے منصوبے بنا رہی تھی جس سے اس ملک میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے. علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے مستقبل کے احساس سے وہ خون کے آنسو روتے تھے. انہیں مسلمان لیڈروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اس قوم کی کشتی کو ان طوفانوں سے بچا کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جائے. لیکن اقبالؒ تو دیدہ ور تھا. اس لئے اس کی نگاہ، سطح سے نیچے اُتر کر گہرائیوں تک جا پہنچی اور وہاں سے اسے وہ گوہرِ تابدار مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا. انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناحؒ کو ایک خط لکھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا. میں سمجھتا ہوں کہ اگر حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے احوال و کوائف کے متعلق کوئی اور دستاویز باقی نہ بھی رہے تو صرف یہ ایک خط ان کی عظمتِ کردار اور بلندئ مقام کی مبین شہادت قرار پانے کے لئے کافی قرار دیا جا سکتا ہے. اقبالؒ نے اپنے اس خط میں لکھا تھا:

میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امید وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

اس مکتوبِ گرامی سے جہاں ایک طرف قائداعظمؒ کی عظمتِ کردار، نیرِ درخشاں کی طرح عالمتاب ہوجاتی ہے، دوسری طرف وہ، حکیم الامتؒ کی دیدہ وری کی بھی بیّن شہادت بن جاتا ہے کہ انہوں نے کن حالات میں، کس شخص کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا اور آنے والے واقعات نے اسے کس قدر سچ کردکھایا۔
مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھے تھے۔ اس دوست نے علامہ کی صحت کی دُعا کی تھی۔ علامہ نے انہیں لکھا تھا:

میرا وقت پورا ہوچکا ہے (اور میرا پیغام ملت تک، مکمل صورت میں، پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور کمال اتاترک کے لئے درازئ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔

(نوائے وقت ۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

اور اب ٹیپ کا بند سنیئے۔ قائداعظمؒ نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبالؒ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے زندہ رہا اور اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبالؒ کی تصنیفات ہیں، تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو تو میں اقبالؒ کی تصانیف کو ترجیح دوں گا۔ (ذکرِ اقبالؒ، عبدالمجید سالک صفحہ ۲۲۶)

عام لیڈروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کونسے

پاپڑ بیلتے اور کس کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، یہ ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائداعظمؒ تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا اور سستی شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں۔ جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناحؒ اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ قائداعظمؒ کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانانِ شملہ نے ان کے لئے تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے اسٹیشن سے وہ ایک کھلے رکشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے۔ لیکن آگے جا کر ایک راستہ لوئر بازار کی طرف اترتا تھا جہاں عوام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائداعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں، انگریز دشمنی کی بنا پر، انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان اپنے ملی راہ نما کو پہلی بار دیکھیں گے۔ وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہنما "اسلامی لباس" میں ملبوس ہوگا ــــــــــــ اسلامی لباس سے اس زمانے میں مُراد شیروانی، شلوار یا پاجامہ اور ترکی ٹوپی تھی۔ وہ جب انہیں اس لباس میں دیکھیں گے تو ان پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا۔ بعض احباب نے کہا اور کچھ نہیں تو جناحؒ صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو نیچے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعہ فال مجھ دیوانے پر پڑا کیونکہ احباب جانتے تھے کہ مجھے قائداعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ وقت کی کمی اور جذبات کی شدت کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر، قائداعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی۔ انہوں نے اسے سُنا، اور اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ مشورہ خوش نہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے میرے کان میں جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ "کیا تم لوگ مجھے مہاتما گاندھی بنا دینا چاہتے ہو۔ جناحؒ ان سطحی حربوں سے پاپولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہوگی تو یہ خود بخود مقبولِ انام ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دلعزیزی بڑی ناپائیدار ہوگی۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔

لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگا جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو" یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوؤں سے اٹھا کر زیب سر کر لیا اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گزرے۔

اب "مہاتما" کی زندگی کی بھی ایک جھلک دیکھتے جائیے جس کی طرف قائداعظمؒ نے اشارہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا وہ ایک دھوتی پہنے، تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور دہلی میں بھنگی کالونی میں قیام پذیر ہوتے تھے تاکہ وہ عوام کے لیڈر بن سکیں۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے تقسیم ہند کے سلسلہ میں اپنے بعض مشاہدات اور واقعات کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کہا تھا کہ اس نے ایک دن مسز سروجنی نیڈو سے کہا کہ

> میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ مہاتما گاندھی کو تھرڈ کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں، اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لئے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں؟

اس کے جواب میں مسز نیڈو نے کہا کہ

> ہم ان کے لئے ریل کے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کراتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جنہیں ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انھیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ دہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے، انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس "بوڑھے" کو اس طرح مفلسی اور اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لئے کانگریس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے، وہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔

بہر حال، یہ تھا قائداعظمؒ کا حسنِ کردار جس سے متاثر ہو کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے کینہ پرور دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ

> جناحؒ کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت۔ اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر سکو۔ نہایت ذہین و فطین۔

وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے
اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ
دیتا اور میں ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں ذرا سا تحرّک پیدا کرنے میں بھی
ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔

اس نے (بی۔بی۔سی) کے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مسٹر جناحؒ پاکستان کو ایک مسلم سٹیٹ کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے دیوانہ تھا۔ (پاکستان ٹائمز، ۱۲ر نومبر ۱۹۸۰ء)

انگریز کے خلاف

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، جن لوگوں کے دل میں تحریکِ پاکستان کے خلاف خبثِ باطن اور قائدِ اعظمؒ کے خلاف آتشِ انتقام شعلہ زن ہے وہ ان کی ذات پر منجملہ دیگر خرافات، یہ الزام بھی لگایا کرتے ہیں کہ تحریکِ تقسیمِ ہند انگریزوں کی اسکیم تھی اور قائدِ اعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔ میں اس سلسلہ میں دو ایک ایسی شہادات پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہو گا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ نے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کو بھی کس طرح لتاڑا اور کس طرح ہر موقع پر ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جب انہوں نے ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ انگریز ہندوؤں کی "ہندوستان چھوڑ دو" کی جارحانہ کارروائیوں سے مرعوب ہو کر، ان کی طرف جھکتا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں برملا کہا کہ

> اگر ہندو اور انگریز نے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا تو غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہو گا ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہو گا۔ اس ظالمانہ اقدام سے برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خطِ تنسیخ کھنچ جائے گا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مسٹر گاندھی نے بھی قائدِ اعظمؒ کے خلاف یہ الزام عائد کیا تھا کہ
مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے

وابستہ ہیں. کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے انہیں مطمئن نہیں کر سکتی.

توانہوں نے کھٹ سے جواب دیا تھا کہ

یہ قطعی افترا اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا. میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں. ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے.

قائد اعظمؒ تو یہ کہہ رہے تھے اور مسٹر گاندھی جو قائد اعظمؒ کے خلاف اس قسم کے الزامات تراش رہے تھے، ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ انہوں نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے جریدہ اسٹیٹسمین میں، برطانوی سامراج کے علیٰ حالہٖ قائم رکھے جانے کی تائید میں لکھا تھا کہ

تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی طاقت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولانگاہ بنالیں گے......... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے وہ تو صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے. پس اگر کسی کو یہ ضرورت ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست بُرد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود رہیں تو وہ کانگریسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے.

مسٹر گاندھی کو انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا. اس کے برعکس، قائد اعظمؒ لنڈن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے حکومتِ برطانیہ پر واضح کر رہے تھے کہ

میں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت، برطانوی قوم کی کر رہی ہے. اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومت

برطانیہ کے سائے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے۔ بنا بریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں، ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔

۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز ہندوستان کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں، اس پر قائداعظمؒ نے راجکوٹ سے بیان شائع کیا جس میں انتہائی پُرجلال انداز میں کہا کہ

میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں، ایسی صورت کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

اسی طرح انہوں نے انگلستان کے اخبار "ڈیلی میل" کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ

مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیانِ ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کریں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہتر ثابت ہو سکے گا۔ اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیانِ ہند کی منشا پر موقوف ہے اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔

ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

اس موضوع پر میں بکثرت دیگر شہادات بھی پیش کر سکتا تھا. لیکن قلتِ گنجائش اس کی مانع ہے. میرا خیال ہے کہ اس سے، خبثِ باطن کی طرف سے عائد کردہ اس اتہام کی تردید ہوگئی ہوگی کہ تقسیمِ ہند کی سکیم برطانیہ کی تخلیق تھی اور قائدِ اعظمؒ اس کے آلۂ کار بن کر کٹھ پتلی کا رول ادا کر رہے تھے. لیکن ان شہادات میں اگر کسی اضافہ کی ضرورت ہے تو میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں. تقسیمِ ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی. ۱۹۷۵ء کے اواخر میں بی. بی. سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈ کاسٹ ہوا تھا. اس میں اس سے سوال کیا گیا کہ

کیا اُس وقت، ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں. ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں. اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا. اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا. جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی. لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی. لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا، اور وہ تھا مسٹر جناحؒ، صدر مسلم لیگ. جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی. مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا.

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں، اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں.

قائدِ اعظمؒ کی سیاست کا یہ انتہائی باکمال کارنامہ ہے کہ انہوں نے یہ چومکھی لڑائی اس انداز سے لڑی کہ نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ جلاؤ گھیراؤ کے فسادات برپا کئے نہ شورشیں اٹھائیں، نہ اینٹ پتھر برسائے. صرف اپنے تدبّر، فراست اور عظمتِ کردار سے یہ مہیب جنگ اس طرح جیت لی کہ تاریخ اس پر آج تک

انگشت بدنداں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معرکہ آرائی میں ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔ تحریک کے دوران تو انہوں نے ان خطرات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا، البتہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی کلب میں انہوں نے اپنی محترمہ بہن مس فاطمہ جناحؒ (مرحومہ) کی جانفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ

جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی وقت بھی گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری ہمت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے، تو میری بہن ہی تھی جو میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ تفکرات، پریشانیوں اور سخت محنت کے زمانے میں، جب میں گھر آتا تھا تو میری بہن روشنی اور امید کی تیز شعاع کی صورت میں میرا خیر مقدم کرتی تھی۔ اگر میری بہن نہ ہوتی تو میرے تفکرات کہیں زیادہ ہوتے۔ میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ اس نے لاپرواہی سے کام نہیں لیا کبھی شکایت نہیں کی۔ میں آج ایسے واقعات کا انکشاف کرتا ہوں جو غالباً آپ نہیں جانتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ ہمیں ایک عظیم انقلاب کا سامنا تھا، ہم گولیوں کی بوچھاڑ میں حتیٰ کہ موت تک کے مقابلے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ میری بہن نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ میرے شانہ بشانہ رہی۔ میری انتہائی معتمد رہی اور مجھے سنبھالے رکھا۔

(فاطمہ جناح "میرا بھائی" بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر، اگست ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۲)

جب ۱۹۴۶ء میں قائداعظمؒ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بمبئی کے مشہور کانگریسی ہفتہ وار اخبار بلٹز نے لکھا تھا کہ

مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناحؒ کی لیڈر شپ (قیادت) کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ لیگ نے پچھلے ہفتہ جو عظیم انقلابی فیصلہ کیا ہے اس سے ہمارے دلوں میں بے ساختہ یہ آواز ابھرتی ہے کہ کاش انڈین نیشنل کانگریس میں، جناحؒ جیسے مسلم الثبوت تدبر کا ماہر کوئی ایک لیڈر ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر جناحؒ کے اس فیصلے نے، انگریز اور کانگریس دونوں کو بوکھلا

کر رکھ دیا ہے اور اس عامیانہ الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں کہ مسلم لیگ، برطانوی استعمار کی پروردہ جماعت ہے۔ (اصفہانی ص۱۴۸)

قائداعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں اس راز کو منکشف کیا تھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ایسے وقت بھی آئے تھے جب ہر آن اُن کی گرفتاری کا امکان تھا۔ اس راز کو انہوں نے اپنی بہن، محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جاں نثارانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے افشا کیا۔ لیکن اس قدر جاں نثار اور رفاقت شعار بہن کو بھی انہوں نے کوئی عہدہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ میں بھی کوئی منصب تفویض کرنا پسند نہ کیا کہ اس میں اقربا نوازی کا شائبہ ہوتا جس نے ہماری حیاتِ ملی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اقربا نوازی کا ایک موقعہ ان کے سامنے آیا جسے ان کی دوسری ہمشیرہ شیریں بائی (مرحومہ) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> جب مرحوم چندریگر نے قائداعظمؒ کے لائق بھانجے، اکبر پیر بھائی کو مقامی مسلم لیگ کی کسی ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بنانے کی تجویز قائداعظمؒ کو پیش کی تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اکبر کی سب سے بڑی "نااہلیت" یہ ہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔
>
> (جنگ کراچی، ۹ جولائی ۱۹۷۴ء بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر، اگست ۱۹۷۶ء)

اس سے آپ قائداعظمؒ کے حسنِ کرداری کا نہیں، دور نگہی اور مآل اندیشی کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔ اس کے ساتھ، یہ بھی دیکھئے کہ اس مردِ جلیل نے یہ ساری لڑائی کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں، پہلے ان مشکلات کا ذکر کیا جو حصولِ پاکستان کی راہ میں درپیش تھیں اور کہا کہ "اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے لیکن میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر بھروسہ ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

> اورنگ زیب روڈ (نئی دہلی) پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں! میرا اسلحہ خانہ اس قدر ہے ــــ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسسٹنٹ (بس یہ ہے ہمارا سازو یراق اور اسلحہ اور فوج)۔
>
> (عربک کالج، دہلی ۱۹۴۲ء بحوالہ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس سازوسامان کے ساتھ لڑنے والا قائد کبھی لڑائی نہیں ہارتا۔ قائد اعظمؒ کے اپنے الفاظ ہیں:۔

اخلاقی قوت، جرأت، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

لیکن ان چار میں ایک اور جزو کو بھی شامل کرنا چاہیئے اور وہ ہے خونِ جگر جس کے بغیر، اقبالؒ کے الفاظ میں، ہر نقش ناتمام رہ جاتا ہے۔ شعرِ اقبالؒ میں تو خونِ جگر ـــــــــ کے الفاظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، لیکن قائد اعظمؒ نے سچ مچ اپنے خونِ جگر سے اس نقش کی تکمیل کی تھی۔

قائدِ اعظمؒ کی صحت

یہ داستان عبرت آموز بھی ہے اور دل سوز بھی جسے میں باچشمِ نم بیان کرسکوں گا۔ آپ بھی دل تھام کر سنئے۔ قائد اعظمؒ کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آرہی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کا بیان ہے کہ

> ہم ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں سے قائد اعظمؒ کو بخار کی شکایت تھی۔ قائد اعظمؒ نے کھانا کھایا اور بستر پہ لیٹ گئے۔ اچانک انہوں نے اونچی اونچی آہیں بھرنا شروع کردیں۔ جیسا کہ کسی آدمی کو گرم لوہے کی سلاخ سے چھوا جاتے۔ میں اسی لمحے ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ دریافت کی اور قائد اعظمؒ نے ہاتھ کے اشارے سے درد زدہ جگہ کی نشان دہی کی۔ درد کی شدت سے ان کی قوتِ ناطقہ جواب دے چکی تھی۔ میں نے درد زدہ جگہ کو ہاتھ لگایا تو ناامید ہوکر اگلے سٹیشن کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ گرم مالش دینے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کروایا جائے۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو میں نے گارڈ کو بلوایا اور گرم پانی کی بوتل لانے کو کہا۔ نیپکن میں لپیٹ کر بوتل کو ماؤف جگہ پہ رکھا جس سے درد میں کمی محسوس ہوئی۔ (میرا بھائی: ص۴۷)

اسی طرح مرحومہ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

۱۹۴۱ء میں ہم بمبئی سے مدراس روانہ ہوئے جہاں قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنی تھی۔ جب ہماری گاڑی مدراس سے کچھ دُور تھی تو قائداعظمؒ اپنی نشست سے اُٹھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ وہ چند قدم چل کر ریل کے لکڑی سے بنے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ معلوم کی۔ قائداعظمؒ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے کہ میں تکان اور کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر قائدؒ میرے کندھوں کا سہارا لے کر اپنے برتھ کی طرف بڑھے۔ خوش قسمتی سے گاڑی سٹیشن پہنچی جہاں ہزاروں مسلم لیگی قائد کا استقبال کرنے کھڑے قائداعظمؒ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا، زور سے چلا کر کہا کہ زیادہ شور نہ کریں کیونکہ قائداعظمؒ تکان اور بخار کی وجہ سے بستر پہ ہیں دوڑ کر ڈاکٹر لے آئیں۔ چند لمحوں میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے معائنے کے بعد کہا کہ فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا نبض گر گئی تھی۔ (میرا بھائی، ص۴۲)

صحت کی اس قدر کمزوری کا تقاضا تھا کہ قائداعظمؒ آرام کرتے۔ مرحومہ کا بیان کا ہے کہ وہ جب بھی انہیں آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ جواب میں کہتے کہ

فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ بھی سُنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پر چلا جائے جبکہ اس کی فوج اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ میں مصروف ہو! (میرا بھائی ص۱۳)

اس جرنیل نے چھٹی نہ لی اور محض اپنی قوتِ ارادی اور مقصد پیشِ نظر سے عشق کے بل بوتے پر مسلسل اور پیہم مصروفِ جنگ رہا ـــــــــ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت اور تن دہی کے ساتھ۔ لیکن یہ قوتِ ارادی، فطرت کے اٹل قانون کا کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتی۔ آخر کار ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جسے اس فدائے ملت نے خاص اہتمام سے راز میں رکھا ـــــــــ حتّٰی کہ اس میں، اپنی زندگی کی سب سے زیادہ معتمد علیہ رازداں، بہن کو بھی شریک نہ کیا۔ یہ راز، راز ہی رہتا اگر اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی ڈائری کے اوراق افشانہ کرتے۔ یہ ڈائری ۱۹۷۵ء میں (فریڈم ایٹ مڈنائٹ) نامی کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تیزی سے گرتی جانے والی صحت کے متعلق قائداعظمؒ

نے اپنے ذاتی ڈاکٹر (جو پارسی تھا) سے مشورہ کیا۔ اس نے "ایکس رے" لے کر کہا کہ آپ کے دونوں پھیپھڑے بُری طرح دق آلود ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے کامل آرام اور سکون اختیار نہ کیا تو آپ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائدِ اعظمؒ نے کیا کہا؟ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس ایکس رے کو کسی کے سامنے آنا چاہیئے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ ایکس رے کی وہ فلم بھی سربمہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض کے لب بھی سِل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس راز کو سربمہر رکھنے سے مقصد کیا تھا؟ اسے اسی کتاب کے مصنفین کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> اگر ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی، اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سربمہر راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیمِ ہند کا حادثہ کبھی رُونما نہ ہوتا۔

ناقابلِ خرید

اس مردِ مجاہد نے اس "حادثہ" کو سربمہر رکھنے کے لئے اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا یہ خونِ جگر رنگ لایا۔ اس نے جان دے کر اس عظیم مملکت کو حاصل کر لیا اور بلا مزد و معاوضہ ہم نا اہلوں کو اس کا وارث بنا کر خاموشی سے دنیا سے چلا گیا۔ اُن کی وفات پر دُنیا بھر کے عظیم مشاہیر نے (جن میں دوست اور دشمن سب شامل تھے) انتہائی احترام و تکریم کے ساتھ ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اگرچہ ان گل ہائے عقیدت کی ایک ایک پتی اپنی جگہ منفرد اہمیت کی حامل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسز سروجنی نیڈو نے (قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں) ان کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ ان کی عظمتِ کردار کی سب سے زیادہ درخشندہ دلیل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ

> میں بڑی مدت سے مسٹر جناحؒ کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے، لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی سکیم پیش کی گئی تو

قائدِ اعظمؒ نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ سکیم پروان چڑھ جائے۔ قائدِ اعظمؒ کو ہمنوا بنانے (بلکہ یوں کہیئے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ

اگر سَنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سَنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے سمجھا کہ صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اتنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے کیا کہا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِ اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر رمزے میکڈانلڈ بیحد متعجب ہوا اور قائدِ اعظمؒ سے الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہے؟ قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔

(بحوالہ چٹان، ۱۶ راگست ۱۹۷۶ء)

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی ‏ ‏ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہ تو ایک صوبے کی گورنری کی پیش کش تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب انہیں پورے ہندوستان کی حکومت کی پیش کش کی گئی۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے بعد تقسیمِ ہند کی سکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کانگریس کے بزرگ ترین لیڈر، مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ

اگر ملکِ معظم کی حکومت ایک نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پر آمادہ ہو تو میں کانگریسی رفقاء کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اپنا وزیرِ اعظم نامزد کرے اور اسے قومی حکومت تشکیل کرنے کا موقع دے۔ میں نے شروع ہی میں مسٹر جناحؒ کو یہ پیش کش اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ اسے بجا طور پر اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دنداں شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا۔

(طلوعِ اسلام، جون ۱۹۷۶ء)

قائدِ اعظمؒ نے اسمبلی کی تقریر میں اس کا جواب یوں دیا :-

اگر مسٹر ایمرے (یعنی نمائندہ حکومتِ برطانیہ) اس تجویز کو منظور کر لیتے اور اس کے بعد مجھے یہ پیشکش کی ہوتی تو کیا اس وقت بھی میری طرف سے اس کا وہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا کہ مسٹر ایمرے اور راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں. میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں.

اور اس تقریر کے آخر میں، یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا کہ

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے ہم اس کی خاطر مسلسل جدّ و جہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے. کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے. جمہوری نظامِ حکومت نکل چکا ہے. ہماری تعداد بے شک کم ہے لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر ہم اس کا تہیّہ کر لیں تو قلتِ تعداد کے باوجود، ہم تمہارے لئے اس سے سوگنا مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگریس نے آج تک کی ہیں. یہ ایک دھمکی نہیں، بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں.

لارڈ زیٹ لینڈ کے جانشین مسٹر ایمرے کو جو جواب ملا تھا وہ آپ پہلے سُن چکے ہیں. اب یہ سنئے کہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لن لتھ گو کے ساتھ کیا بیتی تھی. واضح رہے کہ لن لتھ گو، اپنے رعب و داب اور دبدبہ و طنطنہ کے لئے مشہور تھا. بات یوں ہوئی کہ وائسرائے نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خاں کو بھی شامل کر لیا. قائدِ اعظمؒ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا. اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ کونسل سے مستعفی ہو جائیں. جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائدِ اعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا. ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا. لیکن قائدِ اعظمؒ ٹیلی فون پر بار بار یاددہانی کے باوجود، سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج نہ پہنچے. وہاں جا کر، بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا. اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے. میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں.

آپ کو معلوم ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ "مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں" کمرے سے باہر نکل گئے.

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکاداس نے اپنی کتاب INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM میں لکھا ہے:۔

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں مسٹر جناحؒ کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بیباکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔ (صفحہ ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے مشہور جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی ۱۲ر جولائی ۱۹۴۰ئ کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ ایک ڈکٹیٹر تھے۔ ایسا کچھ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے نہ قائدِ اعظمؒ کی سیرت کا بنظرِ عمیق مطالعہ کیا ہے، نہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے کس قدر خلاف تھی۔ ایک واقعہ سنیئے جسے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری (سید مطلوب حسن صاحب) نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ:۔

ایک مرتبہ ہندوستانی فوج کے ایک کپتان نے ایک محفل میں قائدِ اعظمؒ سے پوچھا کہ کیا پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا؟ قائدِ اعظمؒ نے یہی سوال اس کپتان پر دہرایا۔ اس نے کہا کہ بے شک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائیگا۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے پوچھا کہ تم کس بناء پر ایسا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس بناء پر کہ ہمارا قائد ایسا کہتا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اس کی طرف غصہ بھری آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ آزاد پاکستان میں تم وہ پہلے افسر ہو گے جسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔

(نوائے وقت، ۴ جنوری ۱۹۷۷ء)

بات واضح تھی کہ جو شخص اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا اور ایک بات کو صرف اس لئے مان لیتا ہے کہ اس کے لیڈر نے ایسا کہہ دیا ہے، قائداعظم کے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ آزاد پاکستان میں کوئی عظیم ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

رفقاء کا احترام

یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنے تمام رفقاء کے مقابلے میں قائداعظمؒ کا مقام کس قدر بلند تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے دل میں مخلص کارکنوں کا کس قدر احترام تھا، اس کے متعلق اصفہانی صاحب کی زبان سے سنئے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

یہ اس شام کا واقعہ ہے جب ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے اور راجہ صاحب محمود آباد نے مسٹر جناحؒ اور مس فاطمہ جناح کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہم نے قائداعظمؒ سے اجازت چاہی تاکہ ہم ان کے سیشن میں پہنچنے سے پہلے مجلس عاملہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں خدا حافظ کہتے، انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہر جایئے، ہم اکٹھے سیشن جائیں گے۔ ہمارے لئے یہ فرمان بڑا تعجب انگیز تھا۔ لیکن ہمیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ہم چاروں ایک ہی گاڑی میں پنڈال پہنچے، اور میں اور راجہ صاحب دروازے پر ٹھہر گئے تاکہ قائداعظمؒ اور ان کی ہمشیرہ آگے تشریف لے جائیں اور ہم پنڈال میں ان کے بعد پہنچیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قائداعظمؒ آگے نہ بڑھے اور ہم سے کہا کہ ہم چاروں ہمدوش ایک ہی لائن میں پنڈال میں داخل ہوں گے۔ ہم لاکھوں کے مجمع میں اس طرح چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ انہوں نے انتہائی مسرت کے لہجے میں کہا۔ "میرے عزیزو! کیا تم اس منظر کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم نہیں اٹھے؟ اس لاکھوں کے مجمع کو دیکھو اور پھر سوچو کہ ہم نے تھوڑے سے وقت میں اتنی لمبی مسافت طے کر لی ہے۔ میں آج آپ کو ساتھ لے کر اس لئے پنڈال میں داخل ہوا ہوں کہ میں اس احترام کا اظہار کر سکوں جو آپ کا میرے دل میں ہے اور ان لاکھوں ناظرین

کو دکھا سکوں کہ میں پُرخلوص خدمات کی اتنی قدر کرتا ہوں۔

(صفحات ۱۰۸، ۱۰۷)

سوچئے کہ کیا ڈکٹیٹروں کی یہی ذہنیت ہوتی ہے؟

امیرالمؤمنین!

مسٹر اصفہانی نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ

ایک دفعہ ان کے بعض مدّاحوں نے جوشِ عقیدت میں انہیں امیرالمومنین کہہ کر پکارا۔ انہوں نے فوراً روک دیا اور کہا کہ میں امیرالمومنین نہیں ہوں۔ میری تعریف میں حد سے مت بڑھو۔ (صـ۱۱۱)

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ قائداعظمؒ کو جس قدر گہرا تعلق تھا اور وہاں کے طلباء کے دل میں ان کا احترام جس قدر تھا، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ ان کے اسی احترام اور عظمت کے پیشِ نظر اس یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری کی پیشکش کی لیکن قائداعظمؒ نے اسے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

میں مسٹر جناح ہی اچھا ہوں، آپ کا شکریہ!

(قائداعظمؒ کی خط و کتابت، مرتبہ سید شریف الدین پیرزادہ، صـ۴۰۹)

عام تاثر یہ ہے کہ قائدِاعظمؒ حارو یابس قسم کے قانون داں اور ان منطقی مزاج انسانوں میں سے تھے جن میں حسِ لطیف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح نہیں۔ ان کی شخصیت علامہ اقبالؒ کے اس مثالی کردار کی زندہ پیکر تھی جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ اُو دلِ درد آشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

حسِ لطیف

ان کے آہنی پیکر میں قلبِ سلیم بریشم کی طرح نرم اور پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ حقیقت یہ ہے

کہ جو انسان جذباتِ لطیف سے عاری ہو وہ انسان نہیں حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ حسِ مزاح اسی ذوقِ لطیف کی مظہر ہوتی ہے اور قائدِ اعظمؒ کو اس کا بہرہ وافر عطا ہوا تھا اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق کرنا جانتے تھے۔ اُن کا نشتر ٹھیک ٹھکانے پر لگتا جس سے ان کے ہدف کی کیفیت یہ ہوجاتی کہ ______ جگر میں ٹیس لب ہنسنے پر مجبور ______ اور جب ان کا ہدف گاندھی جیسا مگا حریف ہوتا تو اس طنز کی شوخی رنگین تر ہو جاتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے تمام نیشنل اخبارات نے ایک واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اُچھالا۔ کہا یہ گیا کہ کل شام مہاتما گاندھی شیوگاؤں میں اپنی کُٹیا میں تنہا پرارتھنا میں محو تھے کہ باہر سے ایک بڑا سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی کو اس پر ذرا سا بھی تردد نہ ہوا۔ وہ بدستور پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد چکر لگایا اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اخبارات نے اسے مہاتما جی کی بہت بڑی کرامت قرار دیا اور ملک بھر میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی۔ کچھ صحافی قائدِ اعظمؒ کے پاس آئے اور اُن سے پوچھا کہ آپ نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہے؟ آپ نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ واقعہ صحیح ہو سکتا ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے؟ آپ نے کہا کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ پھر سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کے نزدیک توجیہہ کیا ہے؟ فرمایا PROFESSIONAL ETIQUETTE یہ جواب وہ ہے جس کا لطف تو لیا جا سکتا ہے، تشریح نہیں کی جا سکتی۔ تشریح کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیا جائے۔ یہ دو لفظ ملک کی ساری فضا میں پھیل گئے۔ "مہاتما گاندھی" پر اس سے کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تھی اس مردِ آہن کی حسِ لطیف اور ذوقِ شگفتگی۔

اب ہم زندگی کی اس شاہراہ کی طرف آتے ہیں جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں وہ گھاٹیاں آتی ہیں جن میں بڑے بڑوں تک کے پاؤں بھی پھسل جاتے ہیں لیکن قائدِ اعظمؒ اس دشوار گزار اور ملوث راستے سے بھی پاکیزہ پا گزر گئے۔ اس راستے کا تعلق جنسیات سے ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی پہلی شادی، ان کے والدین نے ان کے بچپن کے زمانے میں کر دی تھی اور وہ بیوی جلد

ہی فوت ہوگئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ۴۰ سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ان کا یہ تمام عہدِ شباب سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ گزرا، درآنحالیکہ دولت، شہرت، قابلیت کے لحاظ سے بھی ان کا شمار ممتاز ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ اور اس کے علاوہ مردانہ حسن و رعنائی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کا ایک ممتاز ترین اور متموّل ترین خاندان تھا جس کے سربراہ، سرڈنشا پیٹٹ، کی اکلوتی لڑکی رتن بائی، حسنِ سیرت وصورت میں بے مثال تھی۔ یہ دونوں شادی پر رضامند ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ سرڈنشا، ایک مسلمان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی پر کس طرح رضامند ہوسکتے تھے؛ لیکن بیٹی کے اصرار پر بالآخر انہیں رضامند ہونا پڑا۔ معاملہ یوں طے پاگیا تو "مسٹر جناح" نے یہ شرط عائد کردی کہ لڑکی کو پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا، تب شادی ہوسکے گی۔ اس پر سرڈنشا کے خاندان میں کہرام مچ گیا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس شرط پر اصرار سے یہ رشتہ استوار نہیں ہوسکے گا۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے "لَو میرج" سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ شادی (سول میرج) کے طریق سے بھی انجام پاسکتی تھی۔ لیکن مسٹر جناح اپنی شرط پر قائم رہے اور شادی نہیں کی جب تک مس رتن بائی نے اسلام قبول نہیں کرلیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مسٹر جناح ہنوز قائداعظم نہیں بنے تھے۔ فقط مسٹر جناح تھے۔

یہی وہ شادی تھی جس کے خلاف ہمارے ہاں کے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کے مدّعیوں نے یہ افترا پھیلایا تھا کہ ؎

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا — یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم

اس رفیقۂ حیات کے انتخاب کے سلسلہ میں اور بھی کئی عناصر کارفرما ہوسکتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ حق گوئی اور بیباکی کی وہ خصوصیت تھی جو خود قائدِ اعظم کے کردار کا بنیادی حصہ تھی۔ اس کی شہادت ہمیں اس واقعہ سے ملتی ہے۔

۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ مسٹر اور مسز جناح اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ ریڈنگ) کے ساتھ لنچ تناول فرما رہے تھے۔ دورانِ گفتگو وائسرائے نے مسز جناح سے کہا کہ وہ جرمنی جانا چاہتے ہیں لیکن ایسا کر نہیں سکتے۔ مسز جناح نے کہا کہ کیوں؟ وائسرائے نے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہاں کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ اس پر مسز جناح نے کھٹ سے کہا کہ پھر آپ یہاں کیسے تشریف لے آئے ہیں؟"

(ڈان کراچی، ۲۸/۱۱/۷۶)

غور فرمائیے کہ کیا یہ خود مسٹر جناحؒ کی صدائے بازگشت نہیں ؟

سحر فرنگ

مسز جناح ۱۹۲۹ئہ میں وفات پاگئیں اور اس کے بعد قائداعظمؒ نے بقیہ ساری زندگی تجرّد میں گزار دی۔ اس دوران میں انہیں کس کس قسم کی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ اس کی ایک مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے تقسیم ہند کی گتھی سلجھانے کے لئے سب سے آخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی ایڈوینا بھی تھی۔ نظر بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یورپین ممالک کی بیویاں زندگی کے ہر شعبہ میں خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس لئے اس وقت اس طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ "محترمہ" کوئی خاص مشن لے کر آئی ہیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے حُسن و جمال، اس کی رعنائیوں اور زیبائیوں، اس کی عشوہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے چرچے عام تھے اور یہی تھے وہ ریشمی جال جنہیں اپنے ساتھ لے کر وہ انڈیا آئی تھی۔ اس کا کسی کو پتا ہی نہ چلتا اگر وہ رچرڈ ہوگ کی مرتب کردہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری شائع نہ ہوتی۔ اس میں اس جادوگرنی کے حیرت انگیز کرتب سامنے آئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے :-

> اس زمانے میں جب ہندوستانی عورتوں کا سیاست میں کچھ نمایاں عمل دخل نہیں ہوتا تھا، مسئلہ تقسیم ہند کی گفت و شنید کے لئے جو (انگریز) اربابِ حل و عقد یہاں آئے تھے ان کی بیویوں نے اس باب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس میں سرِفہرست ایڈوینا تھی۔ اس کی سحر طرازیوں کا اوّلین ہدف جواہر لال نہرو تھا۔ وہ مجرّد تھا اور ایک عورت کی رفاقت سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ (ایڈوینا نے اس راز کو بہت جلد پالیا)، یوں تو اس ساحرہ نے ہندوستان کے سب لیڈروں کو مسحور کیا، لیکن نہرو کے ساتھ اس کے تعلّقات بڑے گہرے ہوگئے۔ ان تعلقات نے انتقالِ اقتدار کے مسئلہ پر گہرا اثر ڈالا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کا اس نے قطعاً بُرا نہ منایا۔ اس کے برعکس وہ اس پر فخر کرتا تھا اور اپنی بیوی کو اس کی داد دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے کمال کر دکھایا! اسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ

ایڈوینا کی رگوں میں یہودی خون بھی تھا۔
حتّٰی کہ گاندھی بھی اس ساحرہ کے جادو سے متاثر ہو گیا اور بہت جلد اسے "میری پیاری دوست" کہنے لگ گیا، اگرچہ ایڈوینا کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت، نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات سے مختلف تھی، ماؤنٹ بیٹن نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور ایک ہی نشست میں گاندھی کو رام کر لیا۔
آپ اس جادوگرنی کے "حصار" سے باہر نکل آیئے اور فخر و مباہات سے HOUGH کے اس اعتراف کو پڑھیئے کہ "اس سارے ہجوم میں اگر کسی پر اس ساحرہ کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ قائداعظمؒ محمد علی جناح تھا۔" اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ لارڈ بٹلر نے (جو کسی زمانے میں وزیرِ ہند رہ چکا تھا) کہا ہے کہ

> ماؤنٹ بیٹن، جناحؒ کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکا۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور گاندھی کے ساتھ جس قسم کے تعلقات وابستہ کر لیئے، جناحؒ اسے کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (ہمیں ان امور کا صحیح صحیح اندازہ کرنا چاہیئے تھا کیونکہ) جناح وہ واحد شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مستقبل کی کلید تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اس نے جناحؒ کے ساتھ بھی وہی حربے استعمال کرنے چاہے جن سے اس نے گاندھی اور نہرو کو رام کر لیا تھا، لیکن وہ اس میں یکسر ناکام رہا۔ جناحؒ میں قطعاً لچک نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی خواب تھا اور وہ تھا ایک جداگانہ مسلم سٹیٹ کا قیام۔ تقسیم سے متعلق گفتگو کی مجالس میں وہ آتا تو ایک لفظ کہے بغیر محض اس کی آمد سے تمام شرکائے محفل پر سکتہ طاری ہو جاتا ــــــ اپنے اصولوں کا پکا، قطعاً نہ جھکنے والا۔ اس سے بات کرنا آسان کام نہ تھا۔ (بالآخر ہمیں اس کے سامنے جھکنا پڑا)۔

آخر میں چند الفاظ اس اعتراض کی تردید میں کہ پاکستان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفاد کے تحفظ کے لیئے حاصل کیا گیا تھا۔ "قائداعظمؒ اور معاشی مسئلہ" ایک مستقل موضوع ہے جس کے

متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے. لیکن میں اس مقام پر اس کی صرف دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۴۴۔ ۱۹۴۳ء میں جنگِ پاکستان اپنی انتہائی شدت پر پہنچ چکی تھی. مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس وقت بڑے بڑے متمول شرکا کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا خاص اجلاس منعقد ہوا. اس کے صدارتی خطاب کے دوران قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

سرمایہ دار اور جاگیردار

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں. وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں. عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے. میں اکثر دیہات میں گیا ہوں. میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی. کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا. اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا. اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ. ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں. اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنی اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام و سہولت سے گزار سکتا ہوں. مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں. میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لئے نہیں کر رہا. میں یہ محنتِ شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں. میں نے ملک میں درد انگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں.

ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔

آخر میں، میں اس خطاب کو نہایت حسین اور دلآویز مقطع پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے کردار میں کندن کی سی صلابت اور ہیرے کی سی درخشندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس نے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) سیرتِ محمدیہ کی شمعِ نورانی سے کسبِ ضیا نہ کیا ہو۔ قائداعظمؒ کی سیرت کی تابندگی بھی اسی کی رہینِ منت تھی۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ ان کی شیفتگی کا کیا عالم تھا اس کی مثال ہمیں اس زمانے میں ملتی ہے جب ان کی عمر ہنوز سولہ سترہ سال کی تھی۔ وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے تو سوال یہ سامنے آیا کہ وہ کس درس گاہ میں داخلہ لیں۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

> میں نے بالآخر "لنکنز اِن" میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بڑے دروازے پر دنیا کے ممتاز ترین مقننین کی جو فہرست کندہ تھی اس میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی بھی شامل تھا۔ (ہیکٹر بولیتھو)

حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی مجلسِ دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ناصحانہ انداز میں کہا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے اسی قسم کی رواداری اور حُسنِ سلوک کا ثبوت دیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبر نے روا رکھا تھا۔ یہ سُن کر قائداعظمؒ نے جھٹ سے جواب دیا کہ

> غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے لئے ہمیں کسی اکبر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے سامنے ہمارے رسولِ مقبولؐ کا اسوۂ حسنہ ہے جنہوں نے عیسائی اور یہودی اقلیتوں سے ایسی کشادہ ظرفی کا برتاؤ کیا تھا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملے گی۔
>
> ہم اس رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کریں گے۔

وہ رسولِ مقبولؐ جن کی شان میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی جشنِ میلادالنبیؐ کی تقریب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حضورؐ کی عزت و تکریم کروڑوں مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپ کی بارگاہ میں سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز ایسی عظیم، بلکہ عظیموں کی بھی عظیم ترین ہستی کو بھلا کیا اور کیسے نذرانہ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسولِ اکرمؐ عظیم مُصلح تھے، عظیم واضعِ قوانین تھے، عظیم سیاستدان تھے، عظیم حکمران تھے، عظیم ترین راہنما تھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

یہ ہیں قائدِ اعظمؒ کی اس عظمتِ کردار اور رعنائی سیرت کی چند جھلکیاں جن کے بل بوتے پر انہوں نے بے تیغ و سناں، جو کبھی لڑائی لڑ کر ایک عظیم مملکت حاصل کر لی۔ تاریخِ عالم کا یہ یقیناً ایک منفرد واقعہ ہے۔

طابَ لہٗ وحسن مآب

شادابیوں اور کامرانیوں کی اس قسم کی پرمسرت داستان کے بعد، میں آپ کی آنکھوں کو غم کے آنسوؤں سے نم آلود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ؎

دِل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج؟
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

مجھے جب بھی، حالاتِ مابعد کے تناظر میں ان حسین خوابوں کی یاد آتی ہے جو میں نے سوتے میں نہیں جاگتے میں دیکھے تھے، تو دل سے ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور بے ساختہ زبان پر آ جاتا ہے کہ ؎

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں!
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے!

پرویز (جنوری ۱۹۸۱ء)

○

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

اس کی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

(اقبالؒ۔ بالِ جبریل صـ ۱۳۲)

○

پیامِ قائدؒ

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا' محبت کی زباں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پَر تیرے
تو اے مُرغِ حرم! اُڑنے سے پہلے پَرفشاں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گُذر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گُلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(اقبالؒ ۔ بانگِ درا صـ ۳۱۲)

کیا
قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

۱۹۷۹ئہ میں محترم محمد منیر (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان کی کتاب FROM JINNAH TO ZIA شائع ہوئی تھی. اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے. اس میں انہوں نے اپنے اس سابقہ خیال کو دہرایا ہے کہ ــــــ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ــــــ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں روزنامہ "پاکستان ٹائمز" میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا DAYS TO REMEMBER اس کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی.

طلوعِ اسلام بابت اگست. ستمبر ۱۹۶۴ئہ میں اس کا مؤاخذہ کیا گیا تھا. میں نے محترم جسٹس کی کتاب کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا کیونکہ میرے خیال میں یہ بات کہنا کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ایسا ہی ہے کہ جیسے کل کو کوئی مؤرخ یہ لکھ دے کہ قائدِ اعظمؒ لنگوٹ باندھ کر مسٹر گاندھی کی پرارتھنا میں جایا کرتے تھے. یعنی بدیہیات کو جھٹلانا.

لیکن میرے ایک بالغ نظر دوست نے مجھ سے کہا ہے کہ محترم جسٹس کی اس کتاب سے پاکستان کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے. وہ طبقہ جو شروع ہی سے پاکستان کے خلاف تھا، ہمارے نوجوان طبقہ میں یہ خیال عام کر رہا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد اس مملکت کو سیکولر بنانا تھا. اس کی تائید میں وہ محترم جسٹس کی کتاب

کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ اور چونکہ محترم جسٹس کے نام کو ان کے سابقہ منصب اور بزرگی کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے یہ پروپیگنڈہ خاصا اثر انداز ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس طبقہ میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ جب پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا مقصود تھا تو ہندوستان سے الگ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ اس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ان سطور کا جذبۂ محرّکہ یہی ہے۔ میں اس سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائداعظمؒ کے ضمن میں بالخصوص، جو کچھ میں کہتا چلا آ رہا ہوں اور کہوں گا، وہ شنید نہیں، دید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) ۱۹۳۰ء کا پاکستانی ہوں جب علامہ اقبالؒ نے (الہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائداعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوعِ اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا اور وہ پاکستان کی اصل و اساس کے تحفظ کے سلسلہ میں، جس کثرت اور شدت سے لکھتا چلا آ رہا ہے شاید ہی کوئی پاکستانی ایسا ہو جو اس سے ناواقف ہو۔ بنا بریں، میں اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کروں گا وہ شنید نہیں، دید ہوگا۔ لیکن "دید" سے یہ مراد نہیں کہ میں زبانی روایات پیش کر دوں گا۔ بلا سند روایات سے تو تاریخ مسخ ہو جاتی ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائداعظمؒ کے ان بیانات اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں اور انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔

محترم جسٹس نے اپنے دعاوی کو ان الفاظ میں سمیٹ کر بیان کیا ہے:-

۱۔ قائداعظمؒ سیکولر ڈیموکریٹک مملکت چاہتے تھے۔ یعنی ایسی سٹیٹ جس میں مذہب کو کاروبارِ مملکت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔ (ص ۳۲)

۲۔ پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام کا خیال نہ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا نہ قائداعظمؒ کے۔ (ص ۳۴)

۳۔ اسلامی مملکت کا تصور قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی بار ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ئ کو لیاقت علی خاں (مرحوم) نے قرارداد مقاصد کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا۔ انہوں نے اس قرارداد کو قائداعظمؒ کی زندگی میں اس لئے پیش نہ کیا کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ (ص ۳۶)

اپنے اس دعوے کی تائید میں محترم نے دو دلائل پیش کئے ہیں :۔

۱۔ قائداعظمؒ نے بار بار کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی (ص ۳، ص ۳۴، ص ۳۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے۔

۲۔ انہوں نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ئ کی تقریر میں اسے واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کی مملکت سیکولر ہوگی۔ (ص ۳۰)

قبل اس کے کہ میں واضح کروں کہ قائداعظمؒ پاکستان میں کس قسم کی سٹیٹ چاہتے تھے۔ میں (جسٹس ممدوح کی بزرگی کے احترام کے باوجود) اتنا گزارش کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ دلیل کہ چونکہ قائداعظمؒ تھیاکریسی نہیں چاہتے تھے اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے' رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اسی طرح خلافِ اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا' قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے' اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں' اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیت گورنر جنرل' فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام براڈکاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا:۔

> پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' یہ امر مسلّمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے

دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں.

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، صـ ۶۵)

تھیاکریسی کی مخالفت

اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں. قائدِاعظمؒ اس طرزِ حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا.

مجھے انتہائی افسوس بلکہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ محترم جسٹس نے اپنی کتاب میں قائداعظمؒ کے اس براڈ کاسٹ کو نقل کیا ہے لیکن اس فقرہ تک کہ "ہم ان کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں:" اس کا اگلا فقرہ جس میں قائداعظمؒ نے واضح کیا تھا کہ تھیاکریسی کیا ہوتی ہے انہوں نے حذف کر دیا ہے.

(کتاب صـ ۳۱، صـ ۳۰)

ان کی بزرگی کا احترام ہمیں اس باب میں کچھ کہنے سے مانع ہے. عدالت کی میزان میں اسے کیا کہا جائے گا، اس کے متعلق ان سے بہتر فیصلہ اور کون دے سکے گا؟

اقبالؒ کی طرح قائداعظمؒ بھی تھیاکریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف. اس لئے کہ تھیاکریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں. علامہ اقبالؒ نے تھیاکریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں. (میں اس مقالہ کو جسٹس ممدوح کی کتاب کے حوالے سے قائداعظمؒ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں) یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا.

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے. روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک ایسے قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی

بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں. ضرورت
اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی
آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے.

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ "اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے. وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے. وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ——— "حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ" ——— "ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے." (خطباتِ اقبالؒ)

قائدِاعظمؒ نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ "مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے نہیں .... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں. اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں ——— (تقاریرِ قائدِاعظمؒ، حصہ اوّل صـ ۴۸)

اس سے ان کی مراد، تھیاکریسی کی مخالفت تھی. اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں. ہمارا نصب العین
تھیاکریسی نہیں. ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے.

(تقاریرِ جناحؒ، شائع کردہ شیخ محمد اشرف، جلد دوم، صـ ۳۸۶)

اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات

وہ تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے. اسلامک سٹیٹ کے اصول و مبانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (میں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا. اس حقیقت کو انہوں

نے حیدر آباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبار کو ۱۹۴۱ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۲ء)

ہمیں امید ہے کہ اس سے محترم جسٹس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قائداعظمؒ تھیاکریسی کی مخالفت کے بعد کس قسم کا سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔

مطالبۂ پاکستان کا مقصد

اب آیئے اس حقیقت کی طرف کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائدِ اعظمؒ اور مخالفین مطالبۂ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفینِ پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا ——— قائداعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگرس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوانِ اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا:۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کریں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ ضمیر، مذہب

اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز ۵/۹/۱۹۳۸ء)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:۔

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، ۱۴-۱۱-۳۹)

۱۹۴۰ء میں جب قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:۔

اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یعنی ایک نجی معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز، ۹-۶-۴۰)

اس رو میں مسٹر گاندھی نے ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا:۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا

خیال رکھے .... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا
پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن، ۱۹۴۶ء۔۱۲۔ ۹)

مسٹر گاندھی کا یہ ردِ عمل، قائداعظمؒ کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اوّل الذکر کو یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی) سے کہا تھا:۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے (لہٰذا، مذہب اور سیاست، دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں، محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور وشغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (تقاریرِ جناحؒ، حصہ اوّل ص ۱۴۰-۱۳۹)

قرآن مجید کی عظمت

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتادیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآنِ عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآنِ مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا وہ پوری تحریکِ پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے

پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے
لیئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ کریم۔
(تقاریر، جلد اوّل، ص ۵۱۶)

۱۳ر نومبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد
ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا،

جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں
ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟ (تقاریر، جلد اوّل، ص ۱۰۸)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب
کرتے ہوئے آپ نے خود ہی یہ سوال اٹھایا:۔

وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح
ہیں؛ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے؛ وہ کون سا لنگر
ہے جس سے اس امّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی عظیم کتاب، قرآنِ مجید ہے۔ مجھے
یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت
پیدا ہوتی جائے گی ——— ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، فلہٰذا ایک
قوم۔ (تقاریر، جلد دوم، ص ۵۰)

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، ملّت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہ بصیرت
ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک
محدود نہیں۔ مشہور مورّخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانتک سے لے کر گنگا
تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات
تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے

قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:۔

اس حقیقت سے سوائے جُہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبئ اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔

(تقاریر، جلد دوم، صفحہ ۳۰)

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس میں جب طلباء نے یہ سوال کیا کہ "مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟" تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:۔

جب میں انگریزی زبان میں مذہب RELIGION[1] کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رُو سے، میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں ______ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلام کے

---

[1] ہمارے ہاں دقت یہ پیش آجاتی ہے کہ قرآنِ کریم میں اسلام کے لئے دین کا لفظ آیا ہے اور لفظ دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں ان کے ہاں صرف RELIGION کا لفظ ہے جس کے معنی مذہب ہیں دین نہیں۔

مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شدّ و مد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائدِاعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

دشمنوں کی گواہی

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:-

نہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطّہ ارض ہو گا جہاں اسلامی حکومت قائم ہو گی۔

(ٹریبیون، ۱۹۴۱ء۔۱۱۔۲)

ضمناً۔ اوائل ۱۹۷۶ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام قائدِاعظمؒ کے جشنِ صدسالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر، پروفیسر ڈاکٹر KRAHNAN نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:-

قائدِاعظمؒ محمد علی کے سامنے ماڈل، قرآنِ مجید تھا۔ (پاکستان ٹائمز، ۲ فروری ۷۶ء)

یعنی بھارت کے مسٹر منشی اور جرمنی کے سکالر تک تو جانتے تھے کہ قائدِاعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے

تھے، لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب:۔

بوٹا بوٹا پتہ پتہ، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا:۔

> پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف وہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا:۔

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائداعظمؒ اور مخالفین میں باعثِ نزاع کیا مسئلہ تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کر لے گا۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت، ہندو نے بھی کی تھی اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سرِفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان کی بناءِ مخالفت سامنے آجائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟ یہ مخالف علماء، باستثناءِ چند، دارالعلوم دیوبند کے مسلک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسلک کیا تھا، اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ

اخبار "مدینہ" (بجنور) کی ۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں، مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:۔

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ ایک مثال ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ لوگ سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائدِ اعظمؒ اس طرزِ حکومت کے مخالف۔ اور یہی دونوں میں بنارِ مخاصمت تھی۔ سیکولر نظام حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہلِ مذہب کو اعتقادات، عبادات، رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو اور امورِ مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے داعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اُس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیت العلماء ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کا ارشاد تھا:۔

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام میں اس آزادی کی اجازت ہے۔

(زمزم، مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۳۸ء)

وہ فرماتے تھے:۔

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہبِ اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ۔ متحدہ قومیت اور اسلام، ص۶۱)

اس کے برعکس، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قائدِ اعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام میں مملکت کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے اس لئے ان علماء کا یہ مسلک اسلام کے خلاف ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قائدِ اعظمؒ اور ان علماء کے اختلاف کی شدت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دے دیا تھا. اس فتویٰ کا جواب (مولانا) شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا. ("رہبرِ دکن" ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء).

۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر

اب آیئے قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی طرف، جسے یہ حضرات ترُپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر صاحب نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی ہے اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا. یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی، بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیمِ ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی. اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائدِ اعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلسِ آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی. اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے. وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا ___ پاکستان میں صورتِ حال اس کے برعکس ہوگی، یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے. ویسے بھی ہندو مؤرخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اُٹھتے ہیں.

بنا بریں، یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا. ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے

ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے اپنی تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

> ——— تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، اس کا امورِ مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں ——— رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ——— میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا اور "اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں"۔ اسی طرح:۔

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان ——— مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائدِ اعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کرکے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائدِ اعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریکِ پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائدِ اعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے

انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ یہ کچھ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائد اعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:۔

> قائدِ اعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصّہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائد اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے جب مجلسِ آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ (جیسا کہ محترم جسٹس نے خود اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات اُبھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان لٹتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارتگری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور دلّی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں (ہیں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِّ عمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوتی ہو اس قسم کے لرزہ خیز

حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (دا کھی) نہ اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے، اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائد اعظمؒ کو پاکستان میں پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائد اعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رُو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائد اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائد اعظمؒ مسلموں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے، یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟

...... مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا چند سال پہلے اُدھر انتقال ہوا ہے)۔ جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا ——

اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی رُو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی..........

۱۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور

۲۔ اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

اقلیتوں کے لئے تحفظات

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کی یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائد اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہاپسندانہ رویّہ اختیار کیا جارہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائد اعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے نہ مسلمان مسلمان بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہوجائے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائد اعظمؒ نے ______ جو خود اس پاکستان کے خالق تھے ______ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دُور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہوجائے گی بالکل پاگل پن ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملّت ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد

اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائد اعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے آخر میں وہ اس سے تائب ہوگئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہی ہوسکتی ہے۔ حُسنِ اتفاق کہ قائدِ اعظمؒ

اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے۔ اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کردی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں، اہلِ امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا، اس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کرچکے ہیں۔ انہوں نے اس کے شروع میں کہا تھا:-

> مملکتِ پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔
>
> (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص ۶۳)

مجھے ایک بار پھر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ محترم جسٹس منیر صاحب نے جس طرح اس براڈ کاسٹ کا وہ حصہ حذف کردیا تھا جس میں قائد اعظمؒ نے بتایا تھا کہ تھیا کریسی کسے کہتے ہیں اسی طرح انہوں نے اس براڈ کاسٹ کا جو اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے (صفحہ ۳۱-۳۰) اس میں اسلامک سٹیٹ کے الفاظ بھی درج نہیں کئے کیونکہ یہ ان کے دعویٰ کی ساری عمارت کو منہدم کردیتے تھے۔

قائد اعظمؒ نے اسی ماہ (فروری ۱۹۴۸ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:-

> مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونِ ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے:-
>
> ایسا، ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان مستقبل پر، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کردوں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف واحترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں، ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم وروایات۔ ہم اپنے اسالیبِ فکر، نقطۂ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صـ ۵۸)

اگر ہم مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرآنِ مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتے امتِ واحدہ ہونے کے اصول ونظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصوّر کو عام ہونے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ تشتت وافتراق تھا۔

"ایمان، ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر" یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع وعظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر (بصد تاسّف) کہنا پڑتا ہے کہ محترم منیر صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقریر کا جو اقتباس دیا ہے (صـ ۳۱) اس میں وہ حصّہ نقل نہیں کیا جس میں ایمان کا ذکر ہے۔ قائداعظمؒ نے ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:۔

ہم مسلمان، ایک خدا، ایک کتاب (قرآنِ مجید) اور ایک رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ کھڑے ہونا ہوگا۔

(تقاریر گورنر جنرل، صـ ۱۳۶)

انہوں نے ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

میرے پیشِ نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقننِ اعظم حضور نبی کریمؐ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیئے۔ (تقاریر گورنر جنرل صـ ۵۶)

تقسیمِ ہند کے عواقب میں جب انگریز، ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کردی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی عین اس حالت میں آپ نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ یاد رکھو:۔

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخرالامر فتح ہماری ہی ہوگی۔

(تقاریر گورنر جنرل صت ۳۰)

میں پوچھنا چاہتا ہوں اربابِ بصیرت سے کہ سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آرہا ہوں......... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جاتے جاتے البتہ ایک اور تاسف کا اظہار بھی ناگزیر ہے۔ محترم جسٹس فرماتے ہیں کہ

قائدِ اعظمؒ نے آیڈیالوجی آف پاکستان (نظریہ پاکستان) کے الفاظ کبھی استعمال نہیں کئے تھے۔ تشکیلِ پاکستان کے پندرہ سال بعد تک بھی کوئی شخص ان الفاظ سے واقف نہیں تھا۔ (صت ۲۸)

قائدِ اعظمؒ پاکستان کے اسلامک سٹیٹ ہونے کے متعلق جو کچھ دس سال تک کہتے رہے اس کے بعد اس کی چنداں اہمیت نہیں رہتی کہ انہوں نے اس خاص اصطلاح نظریہ پاکستان کو استعمال کیا تھا یا نہیں، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کو بھی استعمال کیا تھا۔ مثلاً انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندے کو ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو انٹرویو دیتے ہوئے جہاں یہ کہا کہ

پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہوگی

وہاں نظریہ پاکستان THEORY OF PAKISTAN کے الفاظ بھی استعمال کئے تھے۔

(تقاریر قائد اعظمؒ، جلد دوم، صفحہ ۳۲۷ — ۳۲۶)

پھر انہوں نے ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا تھا:۔

پاکستان سے صرف حریت اور آزادی مراد نہیں۔ اس سے فی الحقیقت مراد مسلم آیڈیالوجی"

ہے جس کا تحفظ ضروری ہے۔ (تقاریر قائداعظمؒ، جلد دوم، صفحہ ۲۶۳)

علاوہ ازیں انہوں نے اسلامک آئیڈیلز قسم کے الفاظ متعدد بار استعمال کیے تھے۔ باقی رہا تشکیل پاکستان کے بعد پندرہ سال کا عرصہ، تو اگرچہ اس سوال کا قائداعظمؒ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر کوئی دیکھنا چاہے تو کم از کم طلوعِ اسلام کے فائل ہی دیکھ لے جس میں "اسلامی آئیڈیالوجی" (نظریۂ پاکستان) پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں، ان تصریحات سے میرا مقصد اس نقصان کے ازالہ کی حسبِ استطاعت کوشش ہے جو پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے خلاف اس قسم کے پروپیگنڈا کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ تنہا اور نحیف سی آواز اس شور و شغب کی کماحقہ حریف نہیں ہو سکتی جو اس مقصد کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں برپا کیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے تو بہرحال اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ یہ پروپیگنڈا کتنے وسیع پیمانے پر عام کیا جا رہا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے ایک خط سے لگائیے جو حال ہی میں مجھے طلوعِ اسلام کے ایک قاری کی طرف سے موصول ہوا ہے:

ہفتہ وار الفتح کراچی، شمارہ ۲۸ ستمبر (۱۸-۱۱) ۱۹۸۰ء میں صـ۲ پر ایک مراسلہ زیرِ عنوان — قائداعظمؒ کیسا نظامِ حکومت چاہتے تھے — نظر سے گزرا۔ اس کی نقل بعینہٖ درج ذیل ہے:

ممتاز سیاسی رہنما عبدالرحمٰن صدیقی (مرحوم) ناقل ہیں کہ "تقسیم ہند سے چند روز قبل نئی دہلی نمبر ۱۰ اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے کہ ڈنر کی میز پر راجہ صاحب محمود آباد نے قائداعظمؒ سے دریافت کیا "پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہوگا؟" قائداعظمؒ نے پوچھا۔ آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیئے؟ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ اسلامی اور ملت کا سب سے زیادہ دیندار، متقی، عالم باعمل صالح ترین شخص کو ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے"

قائداعظمؒ نے کہا "تم بیسویں صدی میں قرونِ وسطیٰ کے حالات کا تصور کر رہے ہو۔ پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہوگی"

راجہ صاحب بولے: "سر! میں نے اتنے برس مسلم لیگ کی جدوجہد محض ایک اسلامی مملکت اور اسلامی آئین کے نصب العین کو سامنے رکھ کر کی تھی"۔ "کون سے اسلام کا؟ اسلام میں بہتر فرقے ہیں"۔ قائد اعظمؒ نے دریافت کیا۔ راجہ صاحب خاموش ہو گئے۔ (کارِ جہاں دراز ہے، جلد دوم، صفحہ ۲۷۱ - ۲۷۲، از قرۃ العین حیدر)

اس وقت نہ عبدالرحمٰن صدیقی دنیا میں موجود ہیں نہ راجہ صاحب محمود آباد اور نہ قائد اعظمؒ۔ محترمہ قرۃ العین حیدر بھارت فرار ہو چکی ہیں اور وہاں جا کر انہوں نے لکھا تھا کہ وہ خود دو قومی نظریے پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اب فرمایئے کہ ہمارے پاس 'ڈنر کے میز' پر اس ٹیبل ٹاک کی تصدیق کا کون سا ذریعہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ ہی اس قسم کی روایات کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے شروع میں کہا تھا کہ قائد اعظمؒ (یا کسی اور) کی طرف ان کی صرف ان باتوں کو منسوب کرنا چاہیئے جو ان کی زندگی میں محفوظ ہو گئی ہوں۔ اس قسم کی وضعی روایات ہی نے تو ہمیں تباہ کیا ہے۔ مندرجہ بالا ایک روایت، ان تمام مجلدات کو غرقاب کر دینے کے لئے کافی ہے جو قائد اعظمؒ کی تقاریر، بیانات، خطابات سے بھرپور ہیں۔ افسانہ ہمیشہ حقیقت سے زیادہ دلکش اور مؤثر ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید نے تیس پاروں میں اپنی جامع تعلیمات کو مکمل کرنے کے بعد جن الفاظ پر اس کتابِ عظیم کا اختتام کیا ہے وہ وسوسہ انگیزی کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴/۴)۔ افسانے وسوسہ انگیزی کا بڑا کامیاب حربہ ہوتے ہیں۔ ان سے افراد ہی نہیں، قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے بتیس سال سے افسانہ طرازی کی یہ کوششیں جاری ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے محرکات سب معاشی تھے۔ کراچی کے ایک پروفیسر قمر الدین خان صاحب دس قدم آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں اسلامی مملکت یا سیاسی نظام کا اشارہ تک نہیں ملتا اور انبیاء کرامؑ صرف پرستش کے طور طریقے سکھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے سرے سے ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔ (ان کا یہ مقالہ روزنامہ ڈان کے اس ضمیمہ میں چھپا تھا جو اگست ۱۹۸۰ء کے یوم آزادی کی تقریب پر شائع ہوا تھا)۔

یہ ہے وہ پروپیگنڈا جو آجکل بڑی شد و مد سے جاری ہے۔ ہم اس باب میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ اس خطۂ زمین کو اپنی حفاظت میں رکھے جسے ہم نے "مسجد" تعمیر کرنے کے لئے حاصل

کیا تھا اس میں شبہ نہیں کہ اس پر ابھی تک "مسجد" تعمیر نہیں ہو سکی۔ اور جنہوں نے اس کی تعمیر کے لئے اس خطہ کے حصول کے لئے تگ و تاز کی تھی (اور ان میں سے جو "اس کے غبارِ کارواں کی طرح" ہنوز زندہ ہیں) وہ اپنے اسی حسین خواب کی تعبیر کے انتظار کے سہارے جی رہے ہیں۔ لیکن اگر (خدا نہ کرے) یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو "تعمیرِ مسجد" کا امکان ہی ختم ہو جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری! اور یہی ان پاکستان دشمن کوششوں کا مقصود ہے۔

اس مقالہ کے شائع ہونے کے بعد مجھے ملک اور بیرونِ ملک کے دور دراز گوشوں سے خطوط موصول ہوئے جن میں کہا گیا کہ جن حقائق کا میں نے انکشاف کیا ہے وہ ان کے علم میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ملک کے ذرائع ابلاغ (پریس) نے میرے خیالات کے گرد جو حصار کھینچ رکھا ہے، اس مقالہ کی (نوائے وقت) میں اشاعت سے اس میں شگاف پڑا اور اس طرح میرے خیالات، طلوعِ اسلام کے حلقہ سے باہر، دور دراز خطوں تک پہنچ گئے۔ ان خطوط میں ایک مطالبہ بطور قدرِ مشترک سامنے آتا ہے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ میں ذرا وضاحت سے بتاؤں کہ تھیاکریسی، سیکولرازم اور اسلامی مملکت میں کیا فرق ہے؟ میں ان موضوعات پر (پاکستان میں) گذشتہ تیس (۳۰) سال سے لکھتا چلا آرہا ہوں لیکن چونکہ یہ مطالبہ ان گوشوں سے موصول ہوا ہے جن تک (اغلباً) اس سے پہلے میرے خیالات نہیں پہنچے اس لئے میں مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

تھیاکریسی کا تصور تو پرانا ہے۔ لیکن اسے بطور نظامِ حکومت، عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبۂ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتہ کیا کہ احکام و قوانین کلیسا (چرچ) وضع کرے لیکن وہ نافذ حکومت کی طرف سے ہوں اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام و قوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعتِ خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف مذہبی پیشوائیت کے جذبۂ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف حکمرانوں کو مقبولیتِ عامہ حاصل ہو گئی کیونکہ

عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظ ان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام وتقدیس کے حامل (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج تک DEFENDER OF THE FAITH کہہ کر پکارا جاتا ہے) ___ مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیاکریسی (یعنی حکومتِ خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظامِ حکومت میں انسانیت ظلم واستبداد کے جس جہنم میں مبتلا رہی' اس کے تصور تک سے (ہمارا آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز خاں تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی تاریخ میں' تھیاکریسی سے بدتر دَور کبھی نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں۔ لیکن جو ظلم وتشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں' فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیاکریسی سے مراد ہے ایسا نظامِ حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام وقوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جاتے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالۂ دار ورسن کر دیا جاتے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیاکریسی کے خلاف جو ردِّ عمل ہوا اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں' مذہب کا دائرہ گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات' قوم کی منشا کے مطابق' کسی قسم کی حدود وقیود کے بغیر' آزادانہ طے پا جائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ اخلاقی اقدار وا صول کی "صدری" کو بھی اتار کر دُور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظامِ حکومت جس میں قانون سازی کے کُلّی اختیارات' کسی قسم کی حدود وشرائط کے بغیر' قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ نظامِ حکومت (کم وبیش) ساری دنیا میں رائج ہے اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں بھی ہے[1]۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے دیکھا کہ اس ملک کے باشندے سخت قسم کے مذہب پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ یہاں یورپ کی شکل کی سیکولرازم چل نہیں سکے گی۔ انہوں نے اس میں یہ ترمیم کی کہ قوانین کو دو حصّوں میں تقسیم

---

[1] اس کی وضاحت میں نے اپنے اس مقالہ میں کی ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی نظامِ حکومت: نہ مغربی جمہوریت ہے نہ شخصی حکومت"۔

کر دیا۔ ایک شخصی قوانین PERSONAL LAWS اور دوسرے ملکی قوانین PUBLIC LAWS
انہوں نے کہا کہ شخصی قوانین کی حد تک ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق
ان کا اتباع کرے۔ لیکن پبلک لاز میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی انہوں نے 'پرسنل لاز کی حد تک'
تھیاکریسی رائج کردی اور پبلک لاز کے لئے سیکولرازم۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ نے اسے
مذہبی آزادی سے تعبیر کیا اور اس کے لئے سلطنتِ انگلشیہ کا بے حد شکر گزار ہوا۔ تحریکِ پاکستان
کے دوران 'یہی موقف (ہندوؤں اور) نیشنلسٹ علماء کا تھا اور اسی کو ساتھ لے کر وہ پاکستان آئے۔
ان کے برعکس 'اقبالؒ' اور قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا۔

اسلامی مملکت میں حقِ حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں
کو۔ یعنی وہ تھیاکریسی، سیکولرازم یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیاکریسی + سیکولرازم، سب کے خلاف
ہوتی ہے۔ اس میں حقِ حکومت خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں وہ اصول
اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔
ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (امت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جزئی
قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔ ان
میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق اور تمیز نہیں ہوتی۔ پبلک لاز کی طرح ان سب کا اطلاق ملک
کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔
اور قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ کہہ لیجئے) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اس مشاورت کی عملی
شکل کیا ہوگی، اسے بھی امت، باہمی مشورہ سے (مندرجہ بالا شرط کے تحت) خود طے کرے گی۔[1]

یہ ہیں اسلامی مملکت کے نمایاں خط و خال۔ قرآنِ کریم نے بہ نصِ صریح کہہ دیا ہے کہ اس کے سوا جو
نظامِ حکومت بھی ہے، وہ کافرانہ نظام ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔ (۵/۴۴)

[1] اس کی وضاحت میرے اس پمفلٹ میں ملے گی جس کا عنوان ہے "تلوار سے تیز اور بال سے باریک۔ اسلامی قانون سازی کا فریضہ۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ جو چیز اسلامی نظامِ مملکت کو غیر اسلامی نظام سے متمیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصولِ اقدارِ خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزّل من اللہ ہوتے ہیں اور ابدی اور غیر متبدّل۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے:۔

.... وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ...... ۝ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے اصول و قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوگئے۔ اب انہیں کوئی اتھارٹی تبدیل نہیں کرسکتی۔ (نیز ۶/۳۴؛ ۱۸/۲۷)۔

سورۂ یونس میں ہے، لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ (۱۰/۶۴) "قوانین و حدودِ خداوندی میں تغیر و تبدّل نہیں ہوسکتا"۔ اس کے برعکس، دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہی بنیادی تخصیص اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں مابہ الامتیاز ہے (سیکولر نظام کے حامیوں کی طرح) جسٹس منیر صاحب، غیر متبدل اصول و حدود کو نہیں مانتے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۵ء کے پاکستان ٹائمز میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا:۔

قانونِ تغیر ایک فطری اصول ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔ ایک ذرۂ ناچیز سے لیکر بڑے سے بڑے کرۂ فلکی تک حرکت اور تغیر کی حالت میں مستقلاً سرگرداں ہیں۔ ہم بھی، جو اس عظیم کائنات کے ایک ذرا سے گوشے کے مکین ہیں، اسی قانونِ تغیر کے زیر اقتدار زندگی بسر کرتے ہیں۔ (ہمارے) اس بیان کی صداقت کے لئے آپ گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالئے۔

شیکسپیئر نے کہا تھا:۔

خیر اور شر فی ذاتہٖ کچھ نہیں۔ یہ ہمارا زاویۂ نگاہ ہے جو کسی بات کو خیر قرار دیتا ہے کسی کو شر۔ (جیسا ہم خیال کریں وہ شے ویسی ہوجاتی ہے)۔ حق اور باطل، غلط اور صحیح

______قانونی نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ______ اضافی ہیں۔ اسی طرح خیر اور شر بھی۔ انسان کا تصورِ حق و باطل اور خیر و شر، سوسائٹی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسے اس بات کا فیصلہ کہ فحش اور بے حیائی کیا ہے، سوسائٹی کے معیار کی رو سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے ماحول سے متأثر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ______ بجز اس کے کہ کوئی بڑی مہیب قوت اسے روکے رکھے ______ اور جس سوسائٹی اور مملکت میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تغیّرات کو نگاہ میں رکھے۔ مذہب پرست طبقہ البتہ غیر متبدل اقدار پر ایمان رکھتا ہے۔

طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۵ء میں اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا تھا:۔

یہ خیالات اسلام کے پیش کردہ تصوّرِ حیات کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ (اسلام تو ایک طرف) نظامِ فطرت کے متعلق بھی محترم مقالہ نگار کی معلومات بھی بڑی سطحی اور ناقص ہیں۔ وہ اگر کسی عام سائنس دان سے بھی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا کہ یہ کارگہِ کائنات، فطرت کے غیر متبدل قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہے اور تغیّرات صرف ان قوانین کے مظاہر ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ سرما میں وہ بالکل ٹھنڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بہار آتی ہے تو ان میں شگفتہ و شاداب تازہ پتیاں اُبھرتی ہیں۔ غنچے چٹکتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، پھل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قانونِ نشو و نما کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ان قوانینِ فطرت میں، جس کی بنیادوں پر اس محیّر العقول کارگہِ کائنات کی عمارت استوار ہے، ذرا سا تغیّر بھی آ جائے تو سارا سلسلۂ کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ خود منیر صاحب اپنی طبیعی زندگی پر غور فرمائیں۔ زندگی کا مدار تنفّس (سانس لینے) کے قانون پر ہے۔ کیا ان کی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس قانونِ حیات میں تغیّر واقع ہوا ہے؟ وہ غالباً اسے "تغیّر" سمجھتے ہیں کہ عام حالات میں انسان از خود فضا میں سانس لیتا ہے۔

سمندر کی تہہ میں یا چاند کی سطح پر، اُسے آکسیجن کا بیگ اپنی کمر پر لادنا پڑتا ہے۔ اور مریض کو آکسیجن ٹینٹ میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہ قانونِ زندگی کے تغیرات نہیں یہ اس قانون پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع واسباب ہیں۔ ذرائع واسباب حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ قانون ہمیشہ غیر متبدل رہے گا ــــــ یہ ہے نظامِ فطرت۔

انسان کی تمدنی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کے لئے بھی قوانین کی ضرورت ہے۔ یہ قوانین (جو وحی کے ذریعے عطا ہوتے ہیں) غیر متبدل رہتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے اسباب و ذرائع بدلتے رہتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قوانین خیر و شر اور حق و باطل کا معیار ہیں۔ منیر صاحب اپنے دعویٰ کی تائید میں شیکسپیر کا قول پیش کرتے ہیں اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللهِ ــــ قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں۔ "مذہب پرستوں" کا خدا کے اس ارشاد پر ایمان ہے جس کی تائید کائنات کا سارا نظامِ فطرت کر رہا ہے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منیر صاحب اپنے دعویٰ کی تائید میں، علامہ اقبالؒ کو بھی پیش فرما رہے ہیں۔ لیکن اسی طرح جس طرح انہوں نے نظامِ فطرت کو اپنی تائید میں پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مندرجہ بالا دعوے کے بعد، خطباتِ اقبالؒ سے حسبِ ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود و تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ــــ وہ تغیر

جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔

منیر صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں (کہ انسان کی تمدنی زندگی میں غیر متبدل کا کوئی تصور نہیں) علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا بیان پیش فرمایا ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ

سخن شناس نہ، دلبرا! خطا اینجاست

جس طرح وہ نظامِ فطرت کے متعلق اتنا نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس میں کس قدر غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اقبالؒ کا بیان ان کی تائید نہیں کر رہا، تردید کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ ثبات و تغیر کے امتزاج کو اصولِ حیات قرار دے رہے ہیں۔ وہ غیر متبدل قوانین کو وہ سہارا قرار دیتے ہیں جس پر انسانی زندگی کا قیام ہے۔ لیکن جس طرح محترم جسٹس منیر نے قائدِ اعظمؒ کے بیانات نقل کرتے ہوئے، ان کے ان حصوں کو حذف کر دیا تھا جو ان کے خلاف جاتے تھے، اسی طرح انہوں نے خطباتِ اقبالؒ میں سے صرف مندرجہ بالا اقتباس درج کیا تھا اور اس سے اگلی سطریں حذف کر دی تھیں۔ کیونکہ وہ بدیہی طور پر ان کے مسلک کی تردید کرتی تھیں۔ علامہ نے لکھا تھا:-

> یورپ کو اپنی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں، اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظرانداز کر رکھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں سیکولرازم اور تھیاکریسی دونوں کا ابطال کر دیا ہے۔ سیکولرازم کا یہ کہہ کر کہ یورپ کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس غیر متبدل اصولِ حیات نہیں اور تھیاکریسی کا یہ کہہ کر کہ مسلمانوں نے صدیوں پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر انہیں مقامِ الوہیت عطا کر رکھا ہے۔ یہ دونوں مسالک خلافِ اسلام ہیں اور قوموں کی تباہی کا موجب۔

جسٹس منیر نے سیکولرازم کے اپنے عقیدہ کی تائید میں پہلے قائد اعظمؒ کا سہارا لینا چاہا اور اس میں ناکام رہے۔ پھر علامہ اقبالؒ کو ساتھ ملانا چاہا تو وہ بھی جواب دے گئے۔

فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ○ (۱۶/۳۷)

جو خدا کی رہنمائی کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کرلے اُسے کوئی حامی و ناصر نہیں مل سکتا۔

والسلام

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(اقبالؒ)

دو قومی نظریہ

(اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی نگاہوں میں)

میرے سابقہ مقالہ میں ضمناً دو قومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیرِ نظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اُسے چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے جن میں کہا گیا کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھار اور اُبھار کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائدِ اعظمؒ کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے، اسی طرح "دو قومی نظریہ" کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہیئے اور اس باب میں علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیئے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کرۂ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) لامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں:-

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا۔۔۔ ۝ (۱۰/۱۹)

ابتدا میں نوعِ انسان ایک ہی اُمت تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرامؑ کا سلسلہ شروع

ہوا ارشاد ہے:۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ص وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ .... ہ (۲/۲۱۳)

نوعِ انسان شروع میں ایک ہی اُمت کے افراد تھے. پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء کرام کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے امتِ واحدہ بنا دیں)۔

نوعِ انسان کی امتِ واحدہ، سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی. خاندان بڑھے تو اس تفریق نے قبائل کی شکل اختیار کر لی. قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہوگئی. اور اب، اس دور میں، اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے. اس تفریق کے لئے کرۂ ارض پر لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آگئے اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پاگئے. اس طرح خدا کی وسیع وعریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا. وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے. اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہے اس کا اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانشوروں) سے مسلسل اُٹھ رہی ہے (یہ بہرحال دوسرا موضوع ہے). آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کی بنیادوں پر پیدا ہوئی. حضرات انبیاء کرام نے (وحیِ خداوندی کی رُو سے)، کہا کہ یہ معیارِ تفریق باطل ہے حقیقی معیارِ تقسیم، فکر ونظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے. زندگی کا ایک تصور مستقل اقدارِ خداوندی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے. جو لوگ اس تصورِ حیات میں ہم آہنگ ہوں، وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں. جو اس تصور کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد. قرآنِ کریم میں ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّ مِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ ۞ (۶۴/۲)

خدا نے تم سب کو پیدا کیا، پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند، عالمگیر انسانیت کی زندگی سے انکار کر دیا، دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔

اور یوں نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطح زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، تفریقِ انسانیت کا یہی معیار ہے جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں، مومن اور کافر یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرام نے اس معیارِ تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا بھی دیا۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں، ان کی اپنی قوم میں، اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بر وحی نظریۂ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ

وَ اَعْتَزِلُکُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ... ۞ (۱۹/۴۸)

میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔

اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سے کہہ دیا کہ

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ز

ہم، تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو، ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔

کَفَرْنَا بِکُمْ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں" وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی" اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو اور یہ عداوت محبت سے اور یہ

نفرت، رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کرو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے ۔ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (۶۰/۴) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ..... ۚ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے" اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں ۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لُوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی، اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (۱۰-۱۱/۶۶) ۔ قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا "تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دَور آگیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے مطابق نبیِ اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے ۔

قومِ رسولِ ہاشمی

اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلال، فارس کا سلمان اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) محمدؐ عربی کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حقیقی چچا) ابولہب "غیر قوم" کے افراد ۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا ۔ جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف ۔ حضرت حذیفہؓ اِدھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف ۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف ۔ حضرت علیؓ اُدھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر ۔ نہیں ! اور آگے بڑھئے ۔ اِدھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مدِمقابل آپ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص ۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی ۔ یہ تھی وہ امتِ محمدیہ وہ ملتِ اسلامیہ، وہ جماعتِ مومنین، جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہِ اشتراک صرف ایمان تھا ۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد:

بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ... ٥ (۸/۷۲) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں" اور ان کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم: بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز" اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ۔

اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ لَا یَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے" وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ... "ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں الجھے رہو" قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۚۖ وَمَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں، لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدۡ بَیَّنَّا لَكُمُ الۡاٰیٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ٥ (۳/۱۱۷) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔ ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ز "اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے" وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَیِّئَةٌ یَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ... ٥ (۳/۱۱۹) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز اُن کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔[1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے ہیں: فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ ..... ٥ (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر

[1] عدمِ گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے مزید آیات کے لئے دیکھئے۔
۳/۲۸؛ ۴/۸۹؛ ۴/۱۳۹؛ ۵/۵۵؛ ۸/۸۳؛ ۹/۱۰؛ ۵۸/۲۲؛ ۱۰-۱۱/۶۰۔

ہے (۵/۴۴). قرآنِ کریم کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فرعی قوانین مرتب کرنے پڑیں، انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو. جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہؐ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا، نہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم. ان کی حکومت خالصتہً جماعتِ مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی. وہ "قومِ مسلم" کے افراد نہیں تھے.

صدرِ اوّل کے بعد

اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح، قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، اور مسلمان بھی، دیگر قوموں کی طرح، نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے. صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آ رہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رُو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سرِ نو یاد دہانی کرائی کہ امتِ محمدیہ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے. یہ پوری امت، ایمان کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ ہے. فکرِ اقبالؒ کے عام ہو جانے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے، چنداں تعجب انگیز نہیں، لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا. وہ ۱۹۰۵ء میں (جب اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا. یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے. (دانایانِ مغرب اس نظامِ نو کو نوعِ انسان کی مشکلات کا راوا قرار دے رہے تھے. چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے. ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیئے تھا. لیکن مؤرخ کی نگاہ یہ دیکھ

کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا ———— مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

اور واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ———— ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل و بنیاد تھا، اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شدومد سے پیش کرتے تھے اس کا اندازہ اس نظم سے لگائیے جو بانگِ درا میں "وطنیت" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں ؎

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ———— ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ———— تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیبِ نوی ہے ———— غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے   اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں بتایا ہے کہ جب قائدِاعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ اس کا ٹیپ کا بند ان کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔

شروع ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"—— ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم، دیوبند کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہیئے کہ مرض الموت میں مُبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلافِ اسلام نعرہ کو سُنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ   ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملّت از وطن است   چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "بمصطفیٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین، خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن امّت کی تشکیل اس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، امّتِ محمدیّہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیّت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسولُ اللہ

سے نسبت ختم ہوجاتی ہے اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہوجائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ط (۶/۱۵۹)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کرلیں اور اس طرح الگ الگ فرقے، پارٹیاں قومیں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہوجاتا ہے۔ اسی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسولؐ اللہ سے رشتہ منقطع ہوجاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت نسبت، وطن کے بجائے حضور نبیٔ اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی ــــــ اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو ــــــ تمام بولہبی است ــــــ پھر دین باقی نہیں رہتا، بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا تھا:

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسولؐ اللہ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسولؐ اللہ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت، ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی .... محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسولؐ اللہ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہوگیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

حضور رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا بوجہل یا کفارِ مکّہ سے فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم خداپرستی پر قائم رہتے ہیں. مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جاسکتی ہے. لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبیِ آخر الزّماں کی راہ نہ ہوتی.

آپ نے غور فرمایا کہ علاّمہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس قدر اُبھار کر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے. لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے. جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کرچکا ہوں، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے. مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسیٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے، لیکن چونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے. یعنی نبوّت کو حضرت عیسیٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ امتِ حضرت عیسیٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے. لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمدؐ رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت، یعنی امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے. اسی اصول کی رُو سے، اگر کوئی شخص، محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی اُمت کا فرد قرار پا جاتا ہے. علاّمہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا تھا کہ جس طرح رسولؐ اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، امتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا ———— انہوں نے کہا کہ:

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مُسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت

> کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے. جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے، بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے.

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالت آبؐ سے رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید امت یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے.

علامہ اقبالؒ کی تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی (مرحوم) اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیئے تھا لیکن اس کے بجائے مولانا مدنیؒ نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا. اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے. جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آرا بیان کو یہاں درج کر دیا جائے، لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے. (ویسے میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں).

(ضمناً) مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد، مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے. انہوں نے یہ کہا تھا کہ آجکل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو قبول کر لیا تھا، اس لئے اس قصّہ کو اب دہرانا نہیں چاہیئے. لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لاتے کہ مولنا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف مبنی بر حقیقت نہیں تھا. اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہی ہے. طلوعِ اسلام نے اُسی زمانے میں اس

کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب نہیں بن پڑا۔ (یہ مقالہ بارِ دیگر طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا؟ جب آنے والا مؤرخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناحؒ۔ وہ جناحؒ جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا، اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے، اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملتِ اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہینِ منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا، اس حقیقت کی پردہ کشائی قائدِ اعظمؒ کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (ہیکٹر بولیتھو) ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> اپنے قیامِ لندن کے دوران مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔
>
> (صفحہ ۹۹)

جناحؒ انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں "جناح کانگریس ہال" دے رہا ہے اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائدِ اعظمؒ نے اسلام کے اس تصورِ قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا اس کی مثالیں آگے چل کر

سامنے آئیں گی. لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان. انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

> پاکستان کا آغاز اس دن ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا. یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی.

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مُسلم اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے.

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈس کالج پشاور میں، ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا:-

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں. ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے. ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے. ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں.

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدومد کے ساتھ ہوئی تھی. پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے. جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں.

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:-

> مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پردازِ خیال ہے. اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے.

جب قائداعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء) ایک خط میں لکھا:۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آبا و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو' وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں وہ اپنے آبا و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط' یوں سمجھئے کہ قائداعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ

اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے' نہ شک و شبہ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے' تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے .... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں) آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی' سیاسی' معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں' میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت

ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا.

(جناح کا خط بنام گاندھی، جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا. اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا:-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں. حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بناء پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا. یاد رکھئے، ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں. دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے. دونوں الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں. دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو.

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس، کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:-

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں. انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا. ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے.

قائدِ اعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدومد سے دہرایا کہ ان کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں. چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن

مسٹر این. سی. دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار" مدینہ" بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا:-

> ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے. مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے. یہ میرے خیال میں، اب نہیں، تو کل حقیقت ہو کر رہے گا........ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے. البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے.

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا. اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا. اس موضوع پر، قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں. انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی. تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا.

میں نے اپنے دوسرے مقالہ میں کہا ہے کہ تقسیمِ ہند اور تشکیلِ پاکستان کے مخالفین، قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے مؤید. وہ وطن کی بنیادوں پر قومیت کے قائل تھے. میں نے اپنے اس مضمون میں (محوّلہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی، لیکن نظریہ قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ "مسلمان اور غیر مسلم" اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے. انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی.

اس نکتہ کی مزید وضاحت ضروری ہے۔

غیر مُسلم اقلیتیں

انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) ۱۴ر جولائی ۱۹۴۷ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:۔

میں ان وعدوں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے۔ اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادت کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریقِ مذہب و ملت و رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔

(بحوالہ نوائے وقت، مؤرخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۷۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائد اعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ر اگست کی تقریر کے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد)

۱۱ر اگست کے بعد

۱۴ر اگست کو مجلسِ آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبر نے کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو

سال پہلے سے چلا آ رہا تھا جب حضور نبی کریمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح
حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان
کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ
اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ
رواداری اور حسنِ سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہی پر
ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطۂ نگاہ سے "دو قومی نظریہ" کا بیّن ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائد اعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں ان سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسنِ سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔

پھر انہوں نے ۳۰ر اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے، خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے

اوران کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہ افتخار ہونا چاہیئے۔

۳ر فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کررہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے خوف اور بداعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کردے۔" انہوں نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہلِ مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے۔ ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانہ میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اُس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت .... ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہورہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے اسی تقریر کے دوران فرمایا:۔

اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے ——— اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اول و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے........ اس لئے اگر

تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجیے۔
صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی، شیعہ سنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:۔

میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں "ایک قوم" کہا ہے اور دوسرے اقتباس میں غیر مسلموں کو "اقلیتیں" ——— فرمایئے کہ ایسا کہنے والا "دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

۱۳ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلاتمیز مذہب و ملت اور بلحاظِ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے

رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہا کہ

> یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزاء کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی اجزاء نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائد اعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اسے کبھی بھی مسلم سٹیٹ، ہندو اسٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور

کے پکار سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔

لہٰذا، قائدِ اعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

نئی نسل کی تعلیم

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائداعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ملک کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جداگانہ قومیت کا تصور دنیا میں رائج نظریاتِ سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آگئے ہیں، لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریاتِ سیاست سے متاثر ہو کر سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہِ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گزارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے رگ و پے میں سرایت کرتا گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالب علموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ DAINIC PAKISTAN کی اشاعت بابت ۲ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ

ہم شری جیتنیا، خودی رام، سبھاس بوس، بہجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسٰی اور علی جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچّوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا:۔

اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے، لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک عزیز الرحمٰن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد سقوطِ ڈھاکہ کے جگر خراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر مسٹر نذر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ

ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر، یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس

سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے سے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

مسز اندرا گاندھی

اِدھر نذر الاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانے کی بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشنِ "فتح بنگالہ" پر ہدیۂ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے، حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دولخت کر دیا۔ اُدھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی" انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع

ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر" دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے.
اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:۔

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے. ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں' ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں. ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں.

یعنی سیکولر ملکتوں میں تو وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں. یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں. یعنی یہ "ارباب دانش" سیکولر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے. اِدھر تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اسی قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں. انہوں نے ۱۹۷۳ئہ میں "ٹائمز آف انڈیا" کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ" چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے. مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا. اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی." انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی. وہ جب ۱۹۶۹ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا. مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے. جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے. ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی، لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں.

(سٹیٹسمین ۷ اکتوبر ۱۹۶۹ئہ' بحوالہ پاکستان ٹائمز ۳ / ۳ / ۷۳ء)

اُدھر والدِ بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور یا دھر ان کے صاحبزادہ خان عبد الولی خان یہ اعلان کر رہے تھے:۔

دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔
پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔
(نوائے وقت، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۲ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرایت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی اشاعت بابت ۴ر نومبر ۱۹۶۸ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ

وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجوڈرو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔
(طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۸ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی (اور ان پر مصائب و آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے) اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک اور بیٹی، عزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ر اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا:۔

اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُر مسرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان ـــــــ ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت، اپنی اور اپنے بال بچوں

کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں. بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے ۴۷ - ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا. اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے. ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے. اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا. ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی. اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں. یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں. جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے. (طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۳)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے "بزرگ سیاستدانوں" نے جب اپنی گاڑی کا رُخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی. سندھ کی "بزرگ ترین سیاسی شخصیت" مسٹر جی ایم سید کی تھی. وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل ۱۹۷۲ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے. یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظامِ حکومت کا تخیل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی.

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ

> ۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے. (المنبر ۴ فروری ۱۹۷۲ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آیئے۔ وہاں کے (اس زمانے کے) وزیرِ اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا کہ

> جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔
>
> (نوائے وقت، ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:

> پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہونگے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہوگی تو پاکستانی قوم کی بات ہوگی۔
>
> (نوائے وقت، ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟ میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیرِ نظر مقصد کے لئے سردست اتنا ہی کافی ہے (ہیں مزید تفاصیل کسی دوسرے وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں)۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ دو قومی نظریہ نہ تو کوئی سیاسی نظریہ ہے اور نہ ہی اسے مطالبہ پاکستان کے لئے سیاسی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ اسی طرح ہمارے دین (اسلام) کا تقاضا تھا (اور ہے) جس طرح مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کا وجود اسلام کا تقاضا تھا (اور ہے) ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہ صرف پاکستان کی الگ مملکت کی وجہ جواز کو ختم کر دیتا ہے بلکہ اسلام کے ایک بنیادی ستون کو منہدم کر دیتا ہے۔ اس کی یہی دینی اہمیت ہے جس کے لئے علامہ اقبالؒ ساری عمر اس کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کی

لڑائی لڑی اور اب میں اسے گذشتہ تیس سال سے پاکستان میں عام کر رہا ہوں۔ یہی نظریہ وحدتِ امت کی بنیاد بن سکتا ہے اور وحدتِ امت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔

والسلام

پرویز